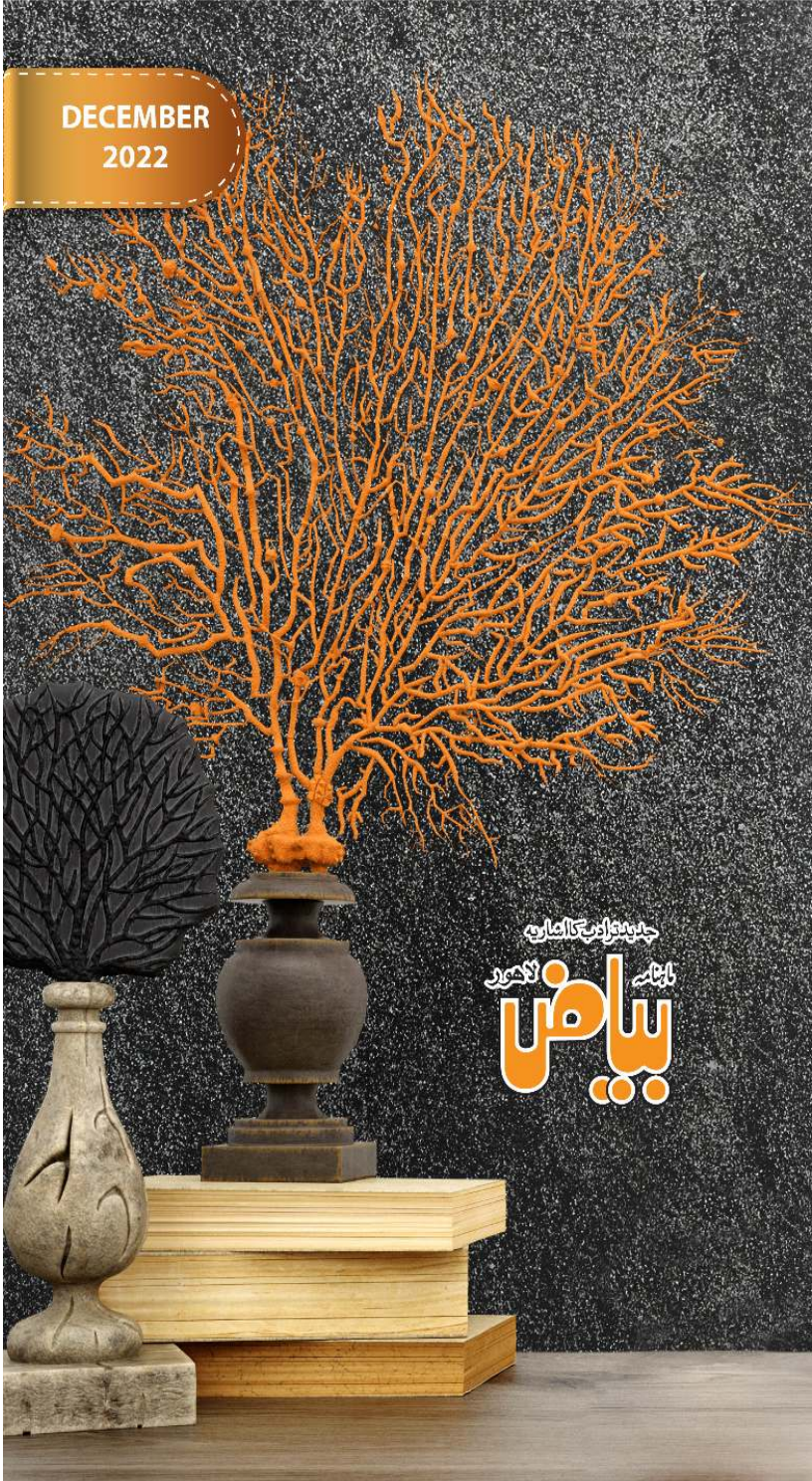

DECEMBER
2022
جدید تر ادب کا اشاریہ
ماہنامہ
بیاض
لاہور

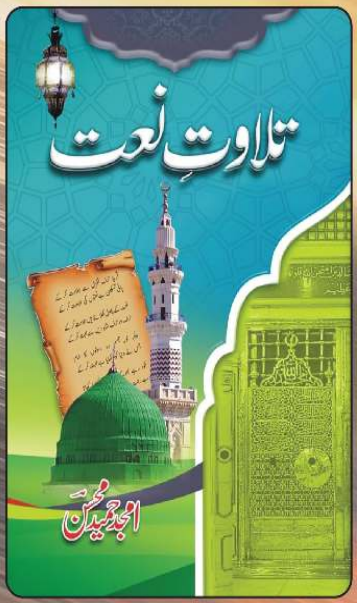
تلاوتِ نعت
امجد حمید محسن

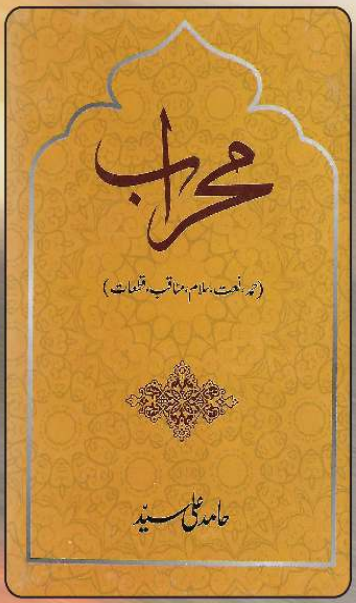
محراب
(حمد، نعت، سلام، مناقب، قطعات)
حامد علی سید

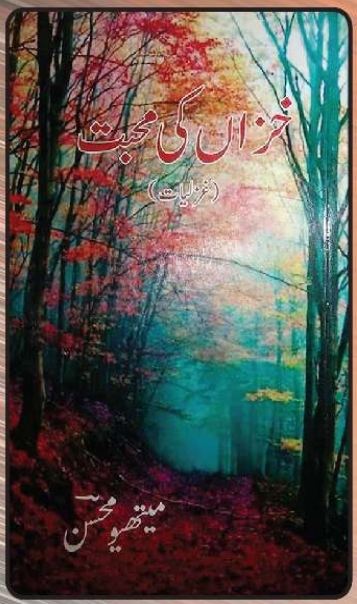
خزاں کی محبت
(غزلیات)
میتھیو محسن

میم
ابو طالب انیم

# غزل

آپ بھی دیں دامن کی ہوائیں
پُھول کہاں تک آگ لگائیں

کچّی نیند میں ہیں اندیشے
انجانے میں جاگ نہ جائیں

دھڑکوں کی لچکیلی شاخیں
ہاتھ تک آئیں ، ہاتھ نہ آئیں

کچّی عمر کا دھن ہیں سپنے
اِک کھٹکے سے ٹوٹ نہ جائیں

راتیں نام نہ لیں کٹنے کا
سڑکیں کب تک ساتھ نبھائیں

بس اک کھٹکا ، بس اک دھڑکا
یاد نہ رکھ لیں ، بھُول نہ جائیں

خالد احمد

# We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

## THE TAQ ORGANIZATION

| Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale |
|---|---|---|

**We are a different organization in Pakistan**

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-6
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

## پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

# بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - دسمبر 2022 - شمارہ نمبر: 12

ایڈیٹر: عمران منظور



مجلس ادارت

| اعجاز رضوی | نعمان منظور | نوید صادق | کنور امتیاز احمد | جاہد احمد |
|---|---|---|---|---|



تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور - 53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور پرنٹر و پبلشر نے ٹریک این ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

# اشاریہ


| نمبر شمار | عنوان | مصنف / مصنفہ | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| 1 | حمد | سید ریاض حسین زیدی، صفدر صدیق رضی | 7 تا 8 |
| 2 | نعت | آصف ثاقب، جلیل عالی، عقیل رحمانی، یعقوب پرواز، حامد علی سیّد، سرور حسین نقشبندی، علمدار حسین، افضل ہزاروی، نبیل احمد نبیل، اعجاز دانش، اسد رضا سحر، اعجاز رضوی | 9 تا 20 |
| 3 | عقیدت | اکرم ناصر، مرزا آصف رسول، مرزا غلام حیدر | 21 تا 24 |
| 4 | قطعات | انور مسعود | 25 |
| 5 | نقات و نقاط | محمد ارشاد | 26 تا 39 |
| 6 | مضامین | حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، نثار ترابی، فرحت عباس شاہ، خاور اعجاز، رخشندہ نوید، ذوالفقار فرخ، فیصل زمان چشتی، عاطف جاوید عاطف، مقصود خالق، نعمان منظور، راحیلہ خورشید، علی رضا، حسنین احمد، کامران محور | 40 تا 95 |
| 7 | آپ بیتی | شوکت علی شاہ | 96 تا 104 |
| 8 | شاعرِ امروز | نادیہ گیلانی، عقیل بخاری | 105 تا 108 |
| 9 | غزلیں | خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، انور مسعود، جلیل عالی، انور شعور، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، خاور اعجاز، صفدر صدیق رضی، محمد انیس انصاری، قیوم طاہر | 109 تا 183 |

| نمبر شمار | عنوان | مصنف / مصنفہ | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| 9 | غزلیں | محسن اسرار، راحت سرحدی، نثار ترابی، سعد اللہ شاہ، حامد یزدانی شاہین عباس، منظور ثاقب، فرحت عباس، عقیل رحمانی، یونس خیال یعقوب پرواز، اقبال سروبہ، افتخار شاہد، شہاب صفدر، احمد جلیل اشرف نقوی، طالب انصاری، افتخار شوکت، شبہ طراز ریاض ندیم نیازی، رخشندہ نوید، اصغر علی بلوچ، ذکی طارق افضل ہزاروی، ملیحہ سید، اکرم ناصر، اکرم جاذب، شاہد ماکلی حسنین سحر، بشیر احمد حبیب، عمران اعوان، شفیق آصف سید فرخ رضا ترمذی، وسیم جبران، احسان الحق مظہر علی حسین عابدی، عاطف جاوید عاطف، انیس احمد، اوصاف شیخ علمدار حسین، رضا اللہ حیدر، محمود کیفی، ارشد محمود ارشد اشرف کمال، سید الطاف بخاری، صغیر احمد صغیر، سعدیہ بشیر ظہور چوہان، فیض رسول فیضان، تاثیر نقوی، تاثیر جعفری سید ضیا حسین، اعجاز دانش، محمد علی ایاز، امتیاز انجم جاوید ڈیئی ایل، غلام مرتضیٰ، شہاب اللہ شہاب نائلہ راٹھور، احمد محمود، عنبرین خان، رانا محمد شاہد، مہر علی | 109 تا 183 |
| 10 | افسانے | ابدال بیلا، [حمزہ حسن شیخ + مسرت کلانچوی]، عاصم بخاری سید تحسین گیلانی، سیدہ آیت گیلانی، نور کمال شاہ | 184 تا 205 |
| 11 | طنز و مزاح / خاکے | انور مسعود ، ناصر بشیر ، محمد کلیم | 206 تا 217 |
| 12 | انشائیہ | صغیر احمد صغیر | 218 تا 220 |
| 13 | نظمیں | [خالد احمد / مترجم: تعبیر علی] امجد اسلام امجد، نسیم سحر خالد علیم، حامد یزدانی، محمد انیس انصاری، اقبال سروبہ نوید صادق، دانش عزیز، امجد بابر، رجب علی رجب رخسانہ سمن ، نائلہ راٹھور ، اعجاز رضوی | 221 تا 238 |
| 14 | خطوط | دردانہ نوشین خان، اشرف کمال، فیض رسول فیضان، رانا محمد شاہد | 239 تا 241 |

# حمد

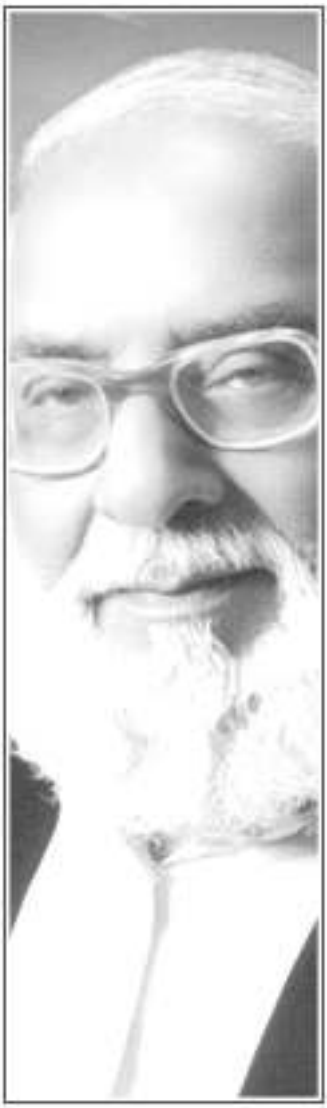

مصیبت کو جب مشکلوں سے گزارا
فقط کام آیا خدا کا سہارا

سفینہ جو منجدھار میں ڈولتا تھا
اسی سے ملا عافیت کا کنارا

مکمل یقیں ہو، وہی راہ بر ہے
کبھی کارواں پر نہ آئے خسارا

ہوں ایثار پیشہ، سخاوت روش ہو
خزانہ وہ دے گا جہانوں کا سارا

دلِ مردِ مومن میں وہ جاگزیں ہے
ہے کارِ صداقت پر اس کا اجارا

کبھی رخ نہ موڑیں رخِ مصطفیٰؐ سے
یہ حکمِ خدا کا ہے واضح اشارا

یہ توحید ہی اصل انسانیت ہے
ریاض عمل ہے اسی سے دل آرا

سید ریاض حسین زیدی

# حمد

درس دیتے ہیں سبھی زُہد و اطاعت کا مجھے
اور کامل ہے یقیں تیری شفاعت کا مجھے

تیرا احساں کہ عطا کی ہے مجھے عُمرِ دراز
لیکن ادراک نہیں ایک بھی ساعت کا مجھے

تیری تخلیق ہوں یارب تری مخلوق ہوں میں
کچھ نہیں علم کسی اور جماعت کا مجھے

کر عطا مجھکو فنِ شعر کی زرخیز زمیں
پھر ہُنر بخش دے لفظوں کی زراعت کا مجھے

ہے یہی حمد یہی نعت یہی میری غزل
اور کچھ شوق نہیں نشرواشاعت کا مجھے

صفدر صدیق رضی

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

وسعتِ کائناتِ عشق دِکھا
رَبِّ قوسین ! نقطۂ پرکار

# نعتؐ

بنیں کوئی مرے ایسا قرینے کا مسافر
خدا جانے میں کب ہوں گا مدینے کا مسافر

عرب کے پاس اٹھا کر ڈالتا ہے جب سمندر
چلا جاتا ہے طیبہ کو سفینے کا مسافر

کرے ہر گام پر سجدہ ہوا ایسے روانہ
جب ایسا شوق رکھتا ہے مدینے کا، مسافر

مدینے کو رواں ہے آنسوؤں کی روشنی میں
نگینے کا مسافر، آبگینے کا مسافر

دعائیں ہیں محمدؐ مصطفیٰؐ کی ساتھ اُس کے
سفر میں حوصلہ پاتا ہے جینے، کا مسافر

چلا جاتا ہے مکّے سے مدینے کو جو ثاقبؔ
مسافت میں مزہ پائے پسینے کا، مسافر

آصف ثاقب

# نعتؐ

اُسؐ کی یادوں کا دیا دل میں جلا رکھا ہے
خود خدا نے جسے محبوب بنا رکھا ہے

اسؐ کے ہونے سے زمانوں کا سفر بامعنی
ورنہ اس عالمِ موجود میں کیا رکھا ہے

ایک مینارۂ تہذیب وہ سیرت جس میں
سب زمانوں کے لیے نورِ حرا رکھا ہے

رہ نکلتی نہیں اور زائرِ طیبہ نے اِدھر
اور بھی شوقِ حضوری کا بڑھا رکھا ہے

یہ کرم کم تو نہیں ہم سے گنہگاروں پر
دل میں اللہ نے دھیان اُسؐ کا جگا رکھا ہے

اُسؐ کے رستوں پہ نہ چلنے سے ہیں دل شرمندہ
اپنے سینوں میں مگر ان کو بسا رکھا ہے

زہے اکرام غبار اپنا ہوا نے عالی
شہِؐ ایام کی دہلیز پہ لا رکھا ہے

جلیل عالی

# نعتؐ

کب تھکے میرے ہات لکھتے ہوئے
حمد ہو یا ہو نعت لکھتے ہوئے

اُنؐ کی خوشبو سے بھر دیا قرآن
حق نے انؐ کی صفات لکھتے ہوئے

کوئی توصیف اُنؐ کی کر نہ سکا
تھک گئی کائنات لکھتے ہوئے

مدحِ آلِ نبیؐ ادھوری رہی
گزری ساری حیات لکھتے ہوئے

نام ہو پانچ کا یا بارہ کا
مل رہی ہے نجات لکھتے ہوئے

شان آقاؐ تری لکھی نہ گئی
بھر گئے شش جہات لکھتے ہوئے

بجھتی جاتی ہے آتشِ دوزخ
روتا جاتا ہوں نعت لکھتے ہوئے

دھڑکنیں تھیں عقیل روضے پر
قلب کی واردات لکھتے ہوئے

عقیل رحمانی

# نعتؐ

بسا رکھا ہے آنکھوں میں جمالِ گنبدِ خضرا
دو عالم میں نہیں کوئی مثالِ گنبدِ خضرا

بہ ہر لمحہ جہاں انوار کے جگنو چمکتے ہیں
مری سانسوں میں روشن ہے خیالِ گنبدِ خضرا

میں اپنی سبز سوچوں کو اُسی کے نام کرتا ہوں
ہوا ہے منعکس جن میں کمالِ گنبدِ خضرا

مری دیرینہ خواہش کو خدایا بار ور کر دے
لیے بیٹھا ہوں مدت سے سوالِ گنبدِ خضرا

ہجومِ خواب سے پرواز ہو کے سرخرو نکلا
کیا جب منتخب اُس نے خیالِ گنبدِ خضرا

یعقوب پرواز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ٹھوکریں فکر کے پڑاؤ ہیں
عشق دانائی کی سواری ہے

# نعتؐ

سرکارؐ سے نسبت ہے مجھے روزِ ازل سے
حاصل یہ سعادت ہے مجھے روزِ ازل سے

رہتی ہے نظر سیرتِ لولاک پہ میری
اس کام سے رغبت ہے مجھے روزِ ازل سے

جیسا بھی ہوں میں اسوۂ سرورؐ کا امیں ہوں
حق بات کی عادت ہے مجھے روزِ ازل سے

مخلوق کی چاہت میں ہوں اے والیٔ یثرب
انساں سے محبت ہے مجھے روزِ ازل سے

اب نعت میں لکھوں گا میں ناموسِ رسالت
لکھنے کی تو عادت ہے مجھے روزِ ازل سے

کثرت سے پڑھوں احمدِ مرسلؐ کا قصیدہ
یعنی یہ ہدایت ہے مجھے روزِ ازل سے

اس دھوپ میں حامد جو میسّر ہے یہ سایا
آقاؐ کی بدولت ہے مجھے روزِ ازل سے

حامد علی سید

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے ماحیٔ غمِ دل و دنیا! ترے لیے
محوِ دعا رہے رسلِ ذوالمنن تمام

# نعتؐ

گو میسر تھیں نعمتیں کیا کیا
آپ نے کیں قناعتیں کیا کیا

سبز گنبد جو دھیان میں آیا
دل نے پائی ہیں راحتیں کیا کیا

آکے طیبہ میں یہ کھلا ہم پر
خاک میں ہیں صباحتیں کیا کیا

مجھ گنہ گار پر خدا کی قسم
آپ نے کیں عنایتیں کیا کیا

شہرِ طیبہ سے ہو کے آئے ہیں
ہم نے دیکھی ہیں جنتیں کیا کیا

بھیجتا ہوں میں جب درود ان پر
جگمگاتی ہیں خلوتیں کیا کیا

دور ہو کر نبی کی سیرت سے
ہم پہ ٹوٹی قیامتیں کیا کیا

میرے آقا کو ہے خبر سرور
لے کے آیا ہوں حاجتیں کیا کیا

سرور حسین نقشبندی

# نعتؐ

خوف کے عالم میں ہوں، سینے پہ دم فرمایئے
یا رسول اللہ ، نبی اللہ ، کرم فرمایئے

راستہ بھی آپ ہیں، منزل بھی میری آپ ہیں
میری آنکھوں پر بھی واقش قدم فرمایئے

آپ ہی بخشش کی ہیں امید میری آخری
نامۂ اعمال میرا خود رقم فرمایئے

شافع محشر بھی ہیں، آقا بھی ہیں، سردار بھی
بوجھ ہے عصیاں کا جو کندھوں پہ، کم فرمایئے

موسمِ گل میں ہے شاخِ زندگی بے برگ و بار
ہاتھ رکھیے شاخِ جاں پر اور خم فرمایئے

یہ جو دنیا ہے ریا کی اس میں دل لگتا نہیں
مجھ کو اپنے حلقۂ الفت میں ضم فرمایئے

یارسول اللہ غم جاں سے میں پا جاؤں نجات
گر عنایت کربلا والوں کا غم فرمایئے

مجھ کو تو درکار ہے آلِ محمد کی ولا
کب کہا میں نے عطا جاہ و حشم فرمایئے

بوذر و قنبر کہاں، مقداد اور میثم کہاں
مجھ کو ان کے نوکروں میں محترم فرمایئے

میرے لفظوں میں ملے اشک مؤدت کی نمی
گوشۂ چشمِ قلم کو اِس سے نم فرمایئے

جنبشِ لب پر نظر ہے، عرصۂ محشر میں ہوں
"کر رہے ہیں نا شفاعت اس کی ہم"، فرمایئے

یا رسول اللہ مجھے خالی تو مت لوٹائیں آپ
یہ نہیں تو اس سے تھوڑا بیش و کم، فرمایئے

علمدار حسین

# نعتؐ

آ رہی ہے صدا مصطفیٰ مصطفیٰ
گنگنائے فضا مصطفیٰ مصطفیٰ

دل کا گوشہ کوئی میں نے چھوڑا نہیں
ہر جگہ لکھ دیا مصطفیٰ مصطفیٰ

اُس کی مشکل ٹلی بن گئی زندگی
وِرد جس نے کیا مصطفیٰ مصطفیٰ

ہے مری یہ دعا، جب بھی آئے قضا
لب سے ہو بس ادا مصطفیٰ مصطفیٰ

مجھ گنہ گار کا مجھ خطا کار کا
کون تیرے سوا مصطفیٰ مصطفیٰ

**افضل ہزاروی**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ زمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تابِ سخن تمام

# نعتؐ

نہ چارسُو نہ کہیں چرخِ ہفت میں سے ملا
خِرد کو نکتۂ توحید شاہِ دیں سے ملا

جہاں کی دانش و حکمت میں یہ کمال کہاں
شعورِ زیست مدینے کی سرزمیں سے ملا

کسے خبر تھی کہ ہم کیا ہیں یہ جہاں کیا ہے
یہ رازِ دولتِ قرآن کے امیں سے ملا

بہارِ عرش کی خُوشبو ہے جس کے دامن میں
وہ لامکاں کا چمن فرش کے مکیں سے ملا

جو دے سکا نہ مجھے کوئی عالمِ کُن میں
وہ رازِ خالقِ دوراں کے ہم نشیں سے ملا

مرے وُجود پہ رحمت کا سایہ ہے موجود
یہ مرتبہ مجھے سُلطانِ مُرسلیں سے ملا

نظر فروز ہے جس میں جمالِ منزلِ عشق
وہ قاعدہ مجھے سردارِ قائدیں سے ملا

جہاں جہاں وہ رُکے اور جہاں جہاں ٹھہرے
نشانِ منزلِ ایماں وہیں وہیں سے ملا

مرے حضور کا ہے لُطفِ بے بہا کہ نبیل
نظر کو حُسن بھی محبوبِ عاشقیں سے ملا



**نبیل احمد نبیل**

# نعتؐ

آنکھوں نے ابھی شہرِ معطر نہیں دیکھا
افسردہ ہے دل روضۂ اطہر نہیں دیکھا

اس عالمِ امکان میں اے شاہِ مدینہ
کوئی بھی ترے قد کے برابر نہیں دیکھا

ہے جس کا تعلق مرے آقاؐ ترے گھر سے
بے در نہیں دیکھا اسے بے گھر نہیں دیکھا

قرآن بھی اس بات کی دیتا ہے گواہی
انسان کوئی آپؐ سے بڑھ کر نہیں دیکھا

جو مائلِ پرواز مدینے کی طرف ہے
اس طائرِ پر شوق کو بے پر نہیں دیکھا

کوئے شہِ ابرار کی کیا شان بتاؤں
نادان کبھی تو نے وہ منظر نہیں دیکھا

ہر عہد کی تاریخ یہ دیتی ہے گواہی
انساں نے کوئی آپؐ سا رہبر نہیں دیکھا

رہتا ہے جہاں نور کی کرنوں کا بسیرا
دانش نے وہی شہرِ منور نہیں دیکھا

اعجاز دانش

# نعتؐ

کچھ اس طرح سے ہم نے سنواری ہے زندگی
صلے علیٰ کا ورد ہماری ہے زندگی

آیا ہے چین مدحتِ سرکار سے مجھے
میں نے پہن پہن کے اتاری ہے زندگی

اب اذن دیجیے کہ زیارت میں کر سکوں
اب تک نجانے کیسے گذاری ہے زندگی

سلمان بن گئے ہیں وہی خوش نصیب لوگ
آ کر جنہوں نے آپؐ پہ واری ہے زندگی

منسوب ہے یہ شاہِ امم سے سو اس لیے
پروردگار کو بھی یہ پیاری ہے زندگی

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے زیبِ زینِ توسنِ زرّیں زمام! رُک
گھبرا کے چھپ نہ جائیں ستارہ سخن تمام

# نعتؐ

ساتھ نہ اُنؐ کا، گر پاؤ گے
چلنے والو تھک جاؤ گے

پھولوں سے معمور ملے گا
دامن جب بھی پھیلاؤ گے

اُنؐ کی غلامی سے بچ کر تم
اپنے آپ میں گھر جاؤ گے

اُن کے ذکر میں مٹنے والو
مٹ کر اور اُبھر آؤ گے

توڑ کے اُنؐ سے پیار کا رشتہ
پھر تم کس کے کہلاؤ گے

اُن کی اک اک بات نرالی
اُنؐ سا اور کہاں پاؤ گے

دامن رحمت تھام لو رضویؔ
پیچھے رہ کر پچھتاؤ گے

اعجاز رضوی

# عقیدت

ترا بول بالا ہے بالکل بجا ہے
"حمد" ہر اک "حمد" کا مستحق وہ خدا ہے
بلا شرکتِ غیر حمدوثنا سے
"حامد" تو "حامد" اگر بن بھی جائے تو کیا ہے
بہت "حمد" کہہ کر بھی "حامد" رہے گا
کہ تیری ثنا کی یہی انتہا ہے
"محمود" وہ "محمود" تیری ثنا سے نہیں ہے
یہاں تو جہاں محوِ حمد و ثنا ہے
وہ "محمود" کیا ہے نہ ہو جس کا "حامد"

عجب فلسفہ ہے عجب ماجرا ہے
تو آ پھر بتاؤں تجھے ایک نکتہ
وہ "محمود" و "حمد" اور "حامد" کا قصہ

زبانوں پہ جاری ہے جو حمدِ باری
حقیقت میں صبحِ ازل کی جہت ہے
ہے لوح و قلم کا وجود اس پہ شاہد
"احمد" کہ "محمود" "احمد" کے رب کی صفت ہے

"حمید" وہ "محمود" و ماجد "حمید" و صمد ہے
"محمد" یہ "احمد" "محمد" ہے سید سند ہے
اسی "حمد" و "تحمید" کا ہے یہ جلوہ

وہ حسنِ ازل ہے، یہ عشقِ ابد ہے
وہ ''محمودؔ'' ہے اُس کا پرتو ''محمدؐ''
اسی منبعِ نور کی ضو ''محمدؐ''
وہ باہم دگر اس قدر متصل ہیں
ہے ''محمودؔ'' بھی ایک نامِ ''محمدؐ''
ادھر یہ حقیقت بھی ہے اک صداقت
ہے ''محمودؔ'' ہی وہ مقامِ ''محمدؐ''
جہاں حمد اور نعت سب گنگ ہوں گے
کہاں ہے حدِ احترامِ ''محمدؐ''

مرزا آصف رسول

# عقیدت

مشکل سہی، مگر میں یہ سنت نبھاؤں گا
ہجرت کے راستے سے مدینہ میں جاؤں گا

اپنے گناہ، ان کے کرم یاد آئیں گے
آنکھیں چراؤں گا، کبھی آنکھیں ملاؤں گا

رکھوں گا اپنے پاس میں اس کو تبرکاً
ان کے حرم سے میں کوئی کنکر اٹھاؤں گا

گاؤں گا پورے شوق سے نعتِ رسولِ پاک
موقع اگر ملے گا تو میں دف بجاؤں گا

قدموں کی دھول غازہ بنی جن کے واسطے
ان راستوں پہ جا کے میں نظریں بچھاؤں گا

کوثر کے جام آپ کے ہاتھوں سے پینے کو
میں حاجیوں کو ہاتھ سے زم زم پلاؤں گا

جھوموں گا خوب گنبدِ خضری کو دیکھ کر
میں تشنگی کچھ اور بھی اپنی بڑھاؤں گا

اک بار مجھ کو پھر سے وہ لے جائیں تو سہی
کس نے کہا کہ اب کے بھی میں لوٹ آؤں گا

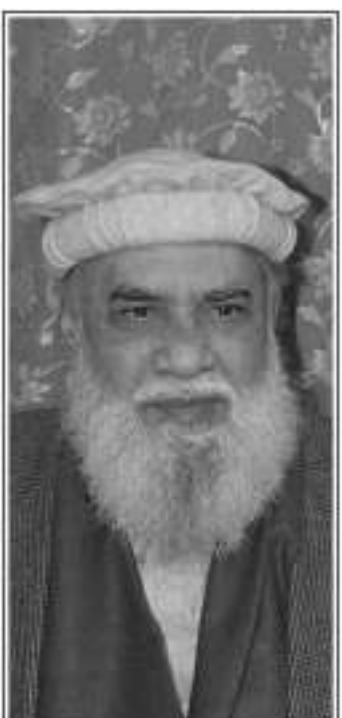

اکرم ناصر

# عقیدت

اے اوّلیں ظہورِ تجلّیٔ کردگار
جلوے ہیں تیرے نور کے ہر سمت بے شمار

تقدیرِ کائنات ترا عزمِ پرشکوہ
تسخیرِ کائنات ترا صبرِ پروقار

ہر نقشِ پا ہے تیرا سوئے خُلد رہنما
یہ موجۂ غبار ہے صد طور در کنار

تیری نمود رحمتِ یزداں کا ظل و عکس
تیرا وجود وحدتِ انساں کا ہے مدار

عقلِ بشر ہے تیرے تفکر سے ارجمند
نظمِ جہاں ہے تیرے تدبر کا شاہکار

والشمس والضحیٰ تری صورت کا آئنہ
سیرت تری کے ظل پہ ہے روح الامیں نثار

انوارِ حق ہیں تیرے تبسم سے جلوہ ریز
آیاتِ حق ہیں تیرے تکلم سے آشکار

بھیجا ہے قدسیوں نے تری ذات پہ سلام
خود ذاتِ حق ہے تیری محبت میں بیقرار

تیرا پیام مردہ دلوں کی حیاتِ نو
تیرا کلام خشک زمینوں کی نو بہار

محروم تیرے فضلِ عمومی سے بہرہ ور
بے مایہ تیری شانِ کریمی سے مایہ دار

تیرے اصولِ دین سے ہے امن کو فروغ
تیرے اصولِ شرع سے ہے عدل استوار

انسانیت پہ تیرے ہیں احسان اس قدر
حیدرؔ! کی کیا مجال کے ان کو کرے شمار

تیرا بیاں ہے رازِ حقیقت کا ترجماں
تیری زباں ہے چشمۂ کوثر کا آبشار

مرزا غلام حیدر

## حقِ ہمسائیگی

در پئے تقریر ہے اِک واعظِ گُنبد گلو
لاؤڈ اسپیکر بھی اُسکے سامنے موجود ہے
نیند کا طالب ہے اک بیمار بھی ہمسائے میں
"کیا کسی کو پھر کسی کا اِمتحاں مقصود ہے"

.....

## دوٹوک

دونوں کی گندگی سے ضروری ہے اِجتناب
دونوں غلاظت اور کراہت کے نام ہیں
دو ٹوک فیصلہ ہے کتابِ مبین کا
سُود بھی اور سُود بھی دونوں حرام ہیں

.....

## شکنجے

اب ایسا ہے کہ اندازے ہمارے
سراسر تجزیاتی ہو گئے ہیں
جو نوآبادیاتی تھے شکنجے
وہ سارے مالیاتی ہو گئے ہیں

.....

## اندازہ کرو

میں کیا بولوں اب ایسے مسئلے پر
خموشی ہی قرینِ مصلحت ہے
کرونا کی بدولت ہم نے جانا
کہ منفی ٹھیک ہے مُثبت غلط ہے

.....

انور مسعود

# نکات ونقاط

بیاض (اکتوبر) کا شمارہ پیش نظر ہے۔ بعض مشمولات کچھ لکھنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ خالد علیم صاحب کا نعتیہ قصیدہ پڑھ کر یاد آیا کہ اس بحر وزن میں ایک نعتیہ قصیدہ حکیم مومن خاں مومن کا بھی کبھی پڑھا تھا، جس کا ایک شعر ہی یاد رہ گیا ہے:

زبانِ لال کہاں اور مدیحِ تاجِ خروس
گرا ہے خاک پہ کیا لعلِ افسرِ کاؤس

.....

تاج خروس سے مراد وہ پھول ہے جسے Cock's Comb کہا جاتا ہے۔ پارکوں اور نرسریوں میں سرخ رنگ میں اور زرد رنگ میں بھی عام مل جاتا ہے۔ مومن کا قصیدہ طویل ہے خالد علیم نے مقابلتاً بہت کم قوافی استعمال کیے ہیں اور بعض کے معانی بھی فٹ نوٹس میں درج کیے ہیں اور تسامحات کے مرتکب بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً کیموس کو کیمسٹری کا معرب لکھا جب کہ یہ اصطلاح طب کی ہے اور اس سے مراد غذا کا وہ حصہ ہے جو دوسرے ہضم کے بعد بدن کا جزو بنتا ہے گوشت، خون، چربی کی صورت میں اور صالح الکیموس کہلاتا ہے۔ معرّب سے مراد کسی غیر زبان کے لفظ کو عربی کی صورت دینا مثلاً تازہ (فارسی) سے طازج، نمونہ سے انموذج اور ترِ پھلہ (ہندی) (آملہ، بہیڑہ، ہرڑ) سے طریفل (آملج، بلیلج، ہلیلج) اور مفرّس (آملہ، بلیلہ، ہلیلہ)۔ امام شرف الدین بوصیری کے قصیدہ بُردہ (چادر) کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہیں برص کا مرض لاحق تھا۔ چادر عطا ہوئی تو مرض جاتا رہا۔ جب کہ زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ نابینا ہو گئے تھے، قصیدہ لکھا، خواب میں چادر عطا ہوئی، آنکھوں سے لگائی تو بینائی لوٹ آئی۔ آپؐ نے عالم بیداری میں صرف دو خوش قسمت خواتین کو بیٹھنے کے لیے اپنی چادر عطا فرمائی۔ دونوں جنگی قیدی بن کر آئیں۔ ان میں سے ایک حاتم طائی کی بیٹی تھی جو قبیلہ طے سے جنگ میں گرفتار ہو کر آئی اور دوسری آپ کی

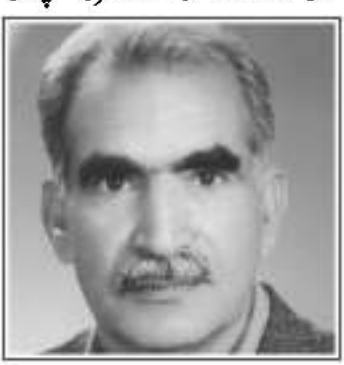

محمد ارشاد

رضاعی بہن شیما سعدیہ جو بنو سعد سے جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں۔ علاوہ ازیں قابوس نامہ کو 'یونان کے مشہور فاتح سکندر کے بیٹے (کیکاؤس بن سکندر) کی پندو نصائح پر مشتمل کتاب' بتایا ہے جو سراسر غلط ہے۔ قابوس نامہ مشہور فاتح سکندر (Alexander) کے کسی بیٹے کی نہیں عنصر المعالی کیکاؤس بن سکندر زیاری کی تصنیف ہے (بزبان فارسی) جس میں اس نے اپنے بیٹے کو حکمرانی کے طور طریقے اور گر بتائے ہیں۔ یہ اس طرح کی کتاب ہے جیسے میکیاولی کی Prince ہے اور ابن خلدون کی الامیر۔ آل زیار ایران کے ایک بہت بڑے خطے پر حکمران رہے ہیں اور اچھی خاصی مدت تک ۳۶۶ تا ۴۳۱ھ حکمران رہے۔ ابوالحسن شمس المعالی قابوس و شمگیر آل زیار کا پہلا حکمران (۳۶۶ھ۔ ۳۷۱ھ) تھا۔ کاؤس ایرانی نام ہے یونانی نہیں ۔ سکندر کو ابتدا میں الکساندر (Alexander) پھر الاسکندر لکھا جاتا رہا پھر سکندر لکھا جانے لگا۔ اس کی وجہ یہ غلط فہمی تھی کہ ال علامت تخصیص ہے جیسے کہ الامیر (The Ruler) الملک (The King)۔ الکساندر، الاسکندر سے صرف سکندر کیسے بنا، اس کی ذمہ داری بڑی حد تک قرآن کے مفسرین پر عائد ہوتی ہے۔ تاریخ سے کامل آگاہی نہ رکھنے وجہ سے ذوالقرنین کا نام پڑھا تو اس سوچ میں پڑھ گئے کہ آخر ایسا کون سا فاتح بادشاہ ہو سکتا ہے جس کی فتوحات کا سلسلہ مشرق و مغرب تک دراز ہو۔ یہ الکساندر ہی ہو سکتا تھا چونکہ ذوالقرنین کا ذکر قرآن میں ایک موحد (مسلمان) بادشاہ کے طور پر ہوا ہے، اس طرح سکندر کو بھی 'سکندر ذوالقرنین' یاد کیا جانے لگا۔ چنانچہ مسلمان بھی اپنے بچوں کے نام سکندر رکھنے لگے۔ اسی سلسلے کی ایک دلچسپ کتاب "نہایۃ الارب فی الاخبارِ الفُرسِ والعرب" انجمن آثار و مفاخر ملی ایران کی شائع کردہ میرے پاس موجود ہے جس کی تصحیح معروف ایرانی فاضل محمد تقی دانش پژوہ نے کی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں مستشرقین مختلف الرائے چلے آ رہے ہیں کہ کس کی تصنیف ہے اور کس زمانے کی ہے۔ کوئی اسے خلیفہ ہارون الرشید کے دور کی تصنیف بتاتا ہے اور کوئی گیارھویں صدی ہجری کی۔ کتاب کا آغاز حدیث قصہ ادریس سے ہوتا ہے اور ابتدائی گیارہ ابواب انبیا کے ذکر پر مبنی ہیں۔ اس کے بعد رستم و اسفندیار سے یزدگرد تک ملوک عجم کا ذکر ہے اور اسی ضمن "حدیث قصۃ الاسکندر و عجائبہ و احادیثہ" اور اس کے بعد کے باب میں عرب ملوک و الطوائف کا ذکر ہے ۔ ایک خط الاسکندر کی طرف سے دنیا بھر کے بادشاہوں کے نام ہے جس میں انھیں کفر و ضلالت

ترک کر کے توحید کی دعوت دی گئی ہے:
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ امابعد۔ فان اللہ جل جلالہ عرّفنی من قدرتہ وعظیم ملکہ..... واخلعوا الآلھۃ التی تعبد ونھا من دونہ..... فاتقوا اللہ ربکم، وحدہ لاشریک لہ۔ یعنی ان کی عبادت چھوڑ دو، اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو ڈرو اللہ سے جو تمھارا رب ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ یہی خط دارا کو بھی ملا، اور اس نے سخت الفاظ میں جواب دیا۔ جنگ ہوئی اور سکندر فتح یاب ہوا۔ کیانیوں کی سلطنت تباہ برباد ہو گئی۔ نظامی نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا (سکندر نامہ)

نسب نامۂ دولتِ کیقباد
ورق بر ورق ہر سوے برد باد

.....

ایران میں پیشدادیوں کے بعد کیانی حکمران ہوئے اور پیشدادیوں کی طرح ان کی تاریخ بھی محیر العقول (دیومالائی حالات اور واقعات سے بھری پڑی ہے۔ گے قبیلے کا نام تھا، کے کی جمع کیاں اور نسبت کیانی اور کئی۔ جبھی تو اقبال نے بھی کہا:

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

.....

کیانی بادشاہوں کے ناموں کے شروع میں اسی وجہ سے کے کا لفظ آتا ہے کیقباد، کیکاؤس، کیخسرو۔ ہمارے یہاں بھی سید احمد، سید عبداللہ، شاہ اسماعیل، شاہ محمود، شاہ ولی اللہ، شیخ عبدالقادر، شیخ محمد اقبال وغیرہ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مسلمانوں نے ایران پر حملہ کیا تو فردوسی نے اس کا ذکر یوں کیا:

زشیرِ شتر خوردن و سو سمار
عرب را بجاے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کند آرزو
تفو برتو اے چرخ گردوں تفو

.....

حالانکہ اس وقت کیانی نہیں ساسانی برسر اقتدار تھے لیکن دیومالائی رنگ و روغن نے کیانی دور کو ضرب مثل دور بنا رکھا ہے۔ یہ کیخسرو تھا جسے اپنے جام میں دنیا بھر کے واقعات دکھائی دیتے تھے۔ فردوسی نے اس دیومالائی جام کو جام کیخسرو ہی بتایا ہے، معلوم نہیں یہ جام جمشید سے کیسے منسوب ہو گیا۔ جم (جمشید) پیشدادی تھا کیانی نہیں۔ جام جم کی آواز جو حسنِ سماعت ہے، جام خسرو میں نہیں شاید اسی وجہ سے اسی کو شہرت ملی۔ مسلمان عرفا و صوفیا نے اسے قلب کی علامت اور اصطلاح کے طور پر متعارف کروایا۔

در جستنِ جام جم جہاں پیمودیم
روزے نہ نشستم و شبے نہ غنودیم
ز اُستاد چو وصفِ جامِ جم بشنودیم
ماجامِ جہاں نمائے جم خود بودیم

.....

گویا انسان کے پہلو میں دھڑکنے والا دل

گوشت کا لوتھڑا نہیں آئنہ ہے بزبان رومی:

آئنہ دل چوں بود صافی و پاک
نقشہا بینی بروں از آب و خاک

..........

اور حافظ نے بھی کہا:

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بےخبر زلذتِ شرب دوامِ ما

اور بیدل تو ہے ہی شاعرِ آئینہ ہا:

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدہ ای دردل کشا بہ چمن درآ

محرم حیرتِ ایں آئنہ می باید بود
کہ بلطفش چہ معانی چہ صور می آید

قاصد و نامہ و پیغام طلسمہائے دل است
محو دل باش کہ زیں کوچہ خبر می آید

..........

اور حدیث قدسی ہے: الا ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله۔ آگاہ رہو کہ جسد انسانی میں مٹھی بھر جما ہوا خون موجود ہے اگر وہ درست ہے تو سارا تن درست ہے اور سالم اگر اس میں فساد ہے تو سارا تن فاسد ہے۔ بزبان بیدل:

معمائے بحر است ایں قطرہ خوں
چو بشگافی آفاق آید بروں
بہ حق تا گرائید حق حاصل است
بہ باطل اگر محو شد باطل است

اور بزبان اقبال:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئنہ ساز میں

..........

خالد علیم نے ایک قافیہ دیوس بھی برتا ہے اور اس کے معنی دیوث بتائے ہیں حالانکہ دیوس کوئی لفظ نہیں۔ لگتا ہے مومن نے دبوس (د ب و س) برتا ہوگا جو سہو کتابت سے دیوس (د ی و س) ہو گیا ہو اور خالد علیم نے اسے ایسا پڑھ کر قیاس سے اس کے معنی دیوث ٹھہرا لیے ہوں۔ دبوس اس دور کے آلات حرب، نیزہ، کمان، کمند، تلوار، خنجر میں شامل تھا اور یہ وہی چیز ہے جسے فارسی میں گرز کہا جاتا ہے انگریزی میں mace تصویروں میں پاکستانی پہلوانوں کے کندھوں پر بھی دکھائی دیتا ہے:

بکام من ار بر نہ گردو جواب
من و گرز و میدان و افراسیاب

..........

مومن کا دیوان میرے پاس موجود نہیں کہ یہ دیکھ سکوں کہ دبوس کا قافیہ کیسے برتا گیا ہے۔ دقیانوس (Decius) کے بارے میں بھی خالد علیم تسامح کا شکار ہیں۔ دقیانوس "روم کا گورنر" نہیں ایمپرر (Emperor) تھا جو 249 سے 251 عیسوی تک تخت نشین رہا۔ اپنے پیشرو کو قتل کر کے تخت نشین ہوا اور خود بھی قتل ہوا۔ Decius سے Decian اور Decianus۔ یونانی

اور لاطینی گرامر کے قواعد کے مطابق Naminative کیس میں us کے حروف بڑھانے پڑتے ہیں جیسے Oceanus سے Ocean اوقیانوس، مسلمانوں کی کتابوں کے تراجم جب لاطینی میں ہوئے تو ہمیں الفارابی کا نام Alfarabius اور الکندی کا نام Alcindius، البتانی کا نام Albetnigius پڑھنے کو ملتا ہے اور یہی نام انگریزی تراجم میں بھی۔ جو مترجمین اس بات سے آگاہ تھے انھوں نے us کے حروف ساقط کر دیے۔ چنانچہ سکندر کے پنجاب پر حملہ کے ذکر میں جہلم کے راجہ پورس (Porus) کا نام بھی آتا ہے۔ اس نام سے چونکہ ہم انگریزی کتب تاریخ کے ذریعے سے آگاہ ہیں ہم بھی اسے پورس ہی لکھتے اور بولتے ہیں۔ 'پورس کے ہاتھی' کے الفاظ بھی ہماری زبان میں داخل ہو گئے استعارے کے طور پر، جبکہ اس کا درست نام پور تھا نہ کہ پورس چنانچہ نہایت الارب ہیں راجہ پورس کا نام ملک الفور لکھا ہے، پ کی آواز عربی میں نہ ہونے کی وجہ سے پ مبدل بہ ف یا مبدل بہ ب۔ المختصر اصحاب کہف کا واقعہ Decius کے زمانے کا ہے۔

ہر چند حضرت عیسیٰؑ کے بعد ڈھائی سو برس گزر چکے تھے لیکن فلسطین اور شام کے ایشیائی ممالک محروسہ کے علاوہ مصر اور شمالی افریقہ کے کئی ممالک پر بھی روم کی حکومت تھی۔ حضرت عیسیٰ چونکہ یہودیوں میں مبعوث ہوئے تھے اس لیے ان پر ایمان لانے والے عیسائی بھی ایک یہودی فرقے کے طور پر متعارف ہوئے۔ حکمرانوں کی نظر میں عیسائی بھی یہودی ہی تھے اصلاً اور نسلاً بھی۔ سارے یہودی مختلف فرقوں صدوقی، فریسی، مسیحی فرقوں میں بٹ چکے تھے اور سبھی رومی مذہب کے خلاف تو تھے ہی رومی ریاست کے بھی خلاف تھے۔ دقیانوس نے سب کے خلاف قتل عام کا حکم دے رکھا تھا۔ انہی میں سے ایک گروہ اصحاب کہف کا بھی تھا جو موحد تھے اور حضرت عیسیٰ کے سچے پیرو۔ وہ بھی حکم عام کی لپیٹ میں آئے لیکن چند ایک نے غار میں پناہ لی۔ یہ لوگ نہ تو رومی بت پرستی کے قائل تھے نہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے نہ تثلیث کے۔ بالکل انہی سالوں میں نوفلاطونی رومی فلسفی فلوطن (Plotinus) کا فلسفہ بھی قبول عام حاصل کر رہا تھا جو The One اور Nous اور Soul کی تثلیث پر مبنی تھا۔ فلوطن* ۲۰۴ء میں پیدا ہوا اور ۲۷۰ء میں فوت ہوا۔ دقیانوس کا ہم عصر تھا۔ یونانی اور

* فلوطن کو مسلمان فلوطن الٰہی کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے فلسفے اور تصوف پر اس کے افکار گہرے اور نمایاں ہیں۔ پرہیزگار شخص تھا ساری عمر تصویر نہیں بنوائی کہ جسد خاکی کی کوئی اہمیت نہیں اور باطن کی تصویر ممکن نہیں۔

رومی عیسائیوں نے اپنے مذہب کو رومی اور یونانی عوام میں قابل قبول بنانے کے لیے حضرت عیسیٰؑ کے توحیدی دین کو باپ، بیٹا اور روح القدس کی تثلیث کے رنگ میں رنگ دیا۔ حالانکہ اناجیل اربعہ (لوقا، مرقس، متی اور یوحنا) میں تثلیث کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ یوحنا کی انجیل میں یہ الفاظ ضرور ملتے ہیں۔ ''ابتدا میں کلام تھا، اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا'' لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ کلام حضرت عیسیٰ میں مجسم و متجسد ہوا۔ بلکہ ''سب چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔'' دوسرے لفظوں میں ہر چیز کُن سے پیدا ہوئی، کُن فیکون۔ کُن خدا کا کلام ہی تو ہے۔ انہی برسوں کی مسیحی تاریخ میں ایک اہم نام St. Cyprian کا بھی ہے جو قرطاجنہ (Carthage) افریقہ کا بشپ تھا جس نے دین عیسیٰ کو تثلیث سے ملوث کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ وہ بھی چھپتا پھرتا رہا لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ پکڑا گیا اور قتل ہوا۔ لیکن جو لوگ حضرت عیسیٰ کے دین پر قائم رہے اصحاب کہف انہی میں سے تھے۔ خالد علیم نے لکھا ہے ''اللہ تعالیٰ نے ان پر تین سو سال کی نیند غالب کر دی'' حالانکہ یہ گمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال پوچھنے والوں کا تھا۔ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ وَازْدَادُوا تِسْعًا ۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۂ کہف ۲۵، ۲۶) وہ اپنے غار میں رہے تین سو سال اور مزید برآں نو سال۔ کہہ دو (اے نبی) جتنی مدت وہ رہے اسے اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ اسی کو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں معلوم ہیں۔ خالد علیم نے ایک قافیہ مجوس بھی برتا ہے اور اس کے معنی آتش پرست تقریباً درست لکھے ہیں۔ مجوس دینِ زردشت کے پیرو ہیں جسے زرتشت، زردہشت بھی لکھا جاتا ہے اور زردہشت بھی، زرتشتر بھی اور زردہشتر بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ جرمن فلسفی نیطشے کی ایک کتاب Thus Spoke Zarathushtra کے بارے میں اکثر لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ زردشت کے بارے میں ہے لیکن ایسا نہیں۔ زرتشت سے مراد خود نیطشے ہے۔ ناگفتہ نہ رہے کہ مجوس کا لفظ مغربی زبانوں میں Magi کی صورت میں موجود ہے اسی سے Magic اور Magician بھی بنے ہیں۔ الفاظ بھی کتنی صورتیں اور کتنے معانی اختیار کر لیتے ہیں۔

'اقبال اور اشتراکیت' (فرح نادر) محنت اور احتیاط سے لکھا گیا مقالہ ہے۔ بے شک اقبال نہ کمیونسٹ (اشتراکی) تھے نہ سرمایہ دارانہ نظام کے مبلغ اور حامی۔ بقول اقبال

''میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے'' اسلام کے بارے میں ہماری عصبیت ہمیں مزید سوالات اٹھانے نہیں دیتی کہ کسی متفقہ نتیجے پر پہنچ پائیں۔ اقبال کے منقولہ الفاظ سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو فاشزم، کمیونزم، سوشلزم، کیپیٹلزم کی طرح کا اور مقابلے کا ازم گمان کرتے تھے۔ لیکن خود انھوں نے اس کے خدوخال واضح نہیں کیے یعنی اسلام کی تعلیمات کی بنیاد پر کسی بھی معاشی یا اقتصادی و سیاسی نظام کے نقشے کو نمایاں نہیں کیا۔ مسلمان کئی فرقوں میں منقسم ہیں اور ہر فرقے کے مفکر کا اپنا زاویۂ نگاہ ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی فرقے کے دو مفکروں میں بُعدِ قطبین پایا جاتا ہے۔ ابوالاعلیٰ مودودی اور غلام احمد پرویز دونوں سُنّی ہیں اور اقبال کے بارے میں خوش رائے بھی لیکن دونوں میں سے اگر ایک آگ ہے تو دوسرا پانی۔ اقبال سے اقبال کے الفاظ میں پوچھا جا سکتا ہے کہ اندریں صورت:

اب تُو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

.....

''اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے'' اس بیان پر سنی، شیعہ سارے مسلمان متفق ہیں لیکن اس مبہم بیان کی تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو اختلافات کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ سعودی عرب میں بھی اسلام کا قانون نافذ ہے ایران میں بھی اسلام کا قانون نافذ ہے لیکن معاشی و اقتصادی و سیاسی نظام؟ اگر کیپیٹلزم نہیں تو اور کیا ہے؟ انڈسٹریل انقلاب کے بعد کی صورت حال زرعی معاشرے کی صورت حال سے سراسر مختلف ہے۔ موجودہ دور مشینی دور ہے۔ فرد اب فرد نہیں رہا مشین کا کل پرزہ بن چکا ہے۔ کمیونزم ہو یا سوشلزم، کیپیٹلزم ہو یا اور کوئی ازم یعنی اسلامزم سب کی بنیاد سرمائے پر ہے چاہے یہ سرمایہ چند ہاتھوں میں ہو یا ایک ہاتھ ریاست میں۔ صرف حنیف رامے (سُنّی) ہی نہیں سجاد ظہیر (شیعہ) بھی اشتراکیت کو اسلام کی روح کے مطابق سمجھنے والوں میں سے تھے۔ ایسا ہی غلام احمد پرویز بھی سمجھتے تھے۔ ''مکمل ضابطۂ حیات'' کا مفہوم آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میری تقریباً پانچ ایکڑ زرعی زمین ہے، زراعت کا تعلق حیات سے لاینفک ہے۔ میری مرضی ہے اس میں گندم کاشت کروں یا گوبھی، شلغم اس کے لیے مجھے کسی عالم دین سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ ان باتوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ حافظ ذہبیؒ نے اور ان کے بعد حافظ ابن قیم نے بھی وہ احادیث زاد المعاد میں درج کی ہیں جن کو طب نبوی کا نام دیا جاتا ہے۔ کیا طب نبوی یا اسلامی

طب کو چھوڑ کر ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی یا آیورویدک (یا یونانی طب کی دواؤں سے علاج خلاف اسلام ہے اور گناہ ہے۔ کیا مولانا مودودی جو اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات کہتے تھے (شاید یہ اصطلاح بھی انہی کی وضع کردہ ہے) اپنے مرض الموت کا علاج کروانے امریکہ نہیں گئے اور وہیں اپنی جان اپنے جان آفریں کے سپرد نہیں کی۔ کیا ہمارا نظام معیشت صرف زکوٰۃ پر قائم کیا جاسکتا ہے؟ بحالیکہ اس سے بھی بچ نکلنے کے شرعی طریقے موجود ہوں۔ زکوٰۃ اسی وقت فرض ہے جب حول کامل ہو اس سے پہلے نہیں۔ اکبر کے دور میں مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری اور ملا عبدالنبی صدر الصدور کے سے علمائے دین حول (سال) پورا ہونے سے پہلے سارا مال اپنی بیوی کے نام ہبہ کردیتے اور یہی کام وہ ٹیک بخت بھی سال کامل ہونے سے پہلے کرتی۔ سچی بات یہی ہے کہ انسان آج تک کوئی ایسا اقتصادی و سیاسی نظام وضع نہیں کر سکا جس میں Pitfalls موجود نہ ہوں۔ ہم کیا جان سکتے ہیں کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کیا پوچھ سکتے ہیں۔ جو سوالات اُٹھائے گئے ہیں، اعتراضات نہیں نہ اختلافات ہیں، اس لیے اٹھائے گئے ہیں کہ زیادہ جاننے والے میرے علم میں اضافہ کرسکیں۔ میں نہ تو مہدی ہوں، نہ مجدد، مصلح یا مبلغ نہ کسی کو ہمخیال ہمنوا بنانے کا خواہاں۔

''بیاض'' کے اسی شمارے میں جناب شوکت علی شاہ کی شاہ داستان حسب معمول جاذب اور جالب بھی موجود ہے۔ اس میں ایک موقعے پر انھوں نے ایک فلم The Hunchback of Notre Dum کا ذکر کیا ہے۔ یہ فلم تو میں نے نہیں دیکھی، میں نے پوری زندگی دس بارہ فلمیں ہی دیکھی ہیں۔ جس ناول پر یہ فلم بنی ہے وہ بھی نہیں پڑھا لیکن اس کے بارے میں مغربی ناقدین ادب کی یہ رائے ضرور پڑھی ہے کہ اس میں دنیا میں پہلی بار بدصورتی میں حسن تلاش کیا گیا ہے۔ نوٹرے ڈم کا کُبڑا تو مصنف کا تخلیق کردہ کردار ہے جس کے کُبڑا پن میں بھی ایک حسن ہے۔ لیکن مغرب کے ناقدین ادب کو معلوم نہیں کہ مشرق میں ایک حقیقی کردار بھی نوٹرے ڈم کے کبڑے سے پانچ صدی پہلے گزرا ہے جو اپنی بدصورتی پر ہی نہیں اپنے ناپسندیدہ ماحول اور موسموں پر بھی فریفتہ تھا۔ مشہور و معروف عرفی شیرازی جسے لڑکپن میں آبلۂ فرنگ کی بیماری نے بدصورت بنا دیا تھا لیکن باطن کی خوبصورتی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

معشوق در آغوش و مرا آئنہ برکف
از بسکہ دلم شیفتۂ زشتی خویش است

.....

معشوق پہلو میں اور میں ہتھیلی پر آئنہ لیے

اپنی بدصورتی پر فدا ہو رہا ہوں۔ وہی عرفی جس نے زاغ اور چغد کی آواز میں بھی وہ حسن ڈھونڈ لیا تھا جو دوسروں کو بلبل اور کوئل کی نغمہ سرائیوں میں ملتا ہے، اور بہار کے بجائے خزاں میں اس کا دل لگتا ہے۔

نیم بہ فصلِ خزاں عرفی از چمن بے فیض
ترانہ ز نواہاے اس کا زاغ می شنوم

اور

مشو عرفی رہینِ باغ و بلبل
بہ بانگِ چغد در ویرانہ می رقص

..........

عجیب شخص تھا یہ عرفی شیرازی جسے اس شہر میں قتل ہونا منظور نہیں جس میں ماتم کا رواج ہو یہاں تک کہ اس قریہ میں زخم تک کھانا بھی نہیں چاہتا جس میں مرہم دستیاب ہو:

نہ شوم کشتہ دراں شہر کہ ماتم باشد
نہ خورم زخم دراں قریہ کہ مرہم باشد

..........

ایران سے ہندوستان آتے ہوئے کشتی میں دریا عبور کرتے وقت سارا کلام ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں گر گیا لیکن اس کے ضیاع پر اسے کوئی افسوس نہیں تھا:

گفتہ گر شد ز کفم شکر کہ ناگفتہ بجا ست
از دو صد گنج یکے مشتِ گہر باختہ ام

..........

کہا ہوا ضائع ہو گیا تو کوئی بات نہیں شکر ہے کہ ان کہا محفوظ ہے۔ دو سو خزانوں میں سے مٹھی بھر گوہر ہی تو ضائع ہوئے۔

ہمارے یہاں یہ خیال عام ہے کہ اس دور میں جو شعرا ایران سے ہندوستان آئے اکبر اور اس کے جانشینوں کی داد و دہش اور انعام واکرام کی خاطر آئے کہ اس دور میں ایران پر صفوی حکمران تھے جو سخت سنگدل اور متعصب حکمران تھے۔ صفوی حکمرانوں پر یہ الزام بے بنیاد تو نہیں لیکن عرفی اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے سے اہل فضل وکمال کے بارے میں یہ خیال درست نہیں۔ عرفی اور ابوالفتح گیلانی (مدفون حسن ابدال) اور کئی دوسرے جان بچانے آئے تھے نہ کہ انعام و اکرام کی خاطر۔ صفوی صفی الدین اردبیلی کی اولاد تھے جو بہت بڑے صوفی اور پیر تھے اور شاہان صفویہ دیگر اثنا عشری صوفیا اور ان کے مریدوں کو گمراہ سمجھتے تھے۔ ہر صفوی بادشاہ اپنے آپ کو مرشد کامل سمجھتا تھا اور اس کا نام ومقام اشھد ان علی" ولی اللہ کے بعد اذان میں لیا جاتا تھا۔ شاہ نعمت اللہ ولی کے پیرو صفویوں سے کم اثنا عشری نہیں تھے لیکن دونوں میں باہمی جنگوں کے نتیجے میں جتنے لوگ مارے گئے اتنے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی جنگوں میں بھی نہیں مارے گئے (ذبیح اللہ منصوری۔ ملا صدرا)۔ جب شیعہ محفوظ نہیں تھے تو سنی کیا محفوظ ہوتے۔ بے شمار سنیوں کو گن پوائنٹ پر تبدیلی مذہب پر مجبور کیا گیا۔

اصفہان کے لوگ سنی تھے وہاں قتل و غارت کا بازار زیادہ گرم تھا۔ پندرہ ہزار سنی قتل ہوئے ہزاروں نے ترکیہ میں پناہ لی۔ سلطان سلیم خان اپنی افواج کے ساتھ صفویوں کے دارالحکومت تبریز پر حملہ آور ہوا۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ پچیس ہزار شیعہ قتل ہوئے اور جانبین سے کل چالیس ہزار مسلمان سیاست گری کی نذر ہو گئے۔ اسماعیلی شیعہ کا نام ونشان مٹا دیا گیا۔ بقیۃ السیف نے ہندوستان میں پناہ لی۔ اس زمانے میں تصوف کے دو نئے سلسلے حروفیہ اور نقطویہ ایران اور ترکیہ میں مقبول ہو رہے تھے۔ عرفی اور حکیم ابوالفتح گیلانی کا تعلق نقطویہ سے تھا۔ ابوالقاسم امری مبلغ و عارف و شاعر نقطوی ..... در سال ۹۷۳ھ مورد تعقیب دینیاں و دولتیاں قرار گرفت و چشمش را میل کشیدند اما دست از کار خود نہ کشید (تا بالآخرہ در ۹۹۹ھ در زنداں بہ دستِ متعصباں کشتہ شد) بعید نیست کہ عرفی کہ جوانے اہل فضل و کمال و کنجکاو بود در یں حلقہ تردد داشتہ ولقب ''ملحد'' کہ براو نہادہ اند از ہمیں راہ و بہ ہمیں مناسبت باشد۔ سال ۹۸۹ھ بہ حسابے سال ظہور موعود نقطوی است و نقطویاں از ہر سوے رو بہ ہند نہادند۔ ظاہراً عرفی ہمچوں دیگر متہماں و متواریانِ ایں نحلہ در ہمیں سال بہ بندر فتہ (دانش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ۶۴، ۶۵)

مجلہ دانش میں درج بالا تحریر علی رضا ذکاوتی کی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ شیخ الطائفہ ابوالقاسم امری نقطوی کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر بینائی سے محروم کر دیا گیا لیکن باز نہ آیا بالآخر زنداں میں متعصبوں کے ہاتھ قتل بھی ہوا (۹۹۹ھ)۔ عرفی نے ملحد کا لقب بحساب جمل پایا اور ۹۸۹ ہجری میں اس طائفے کے لوگوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ یہ ''دینیاں و دولتیاں'' کون تھے؟ ملا باقر مجلسی اور ملا شمسائے گیلانی اور ان کے ہمخیال دیگر مُلا۔ معروف فلسفی صدرالدین (ملا صدرا) بھی قلعہ کہک میں نظر بند کر دیا گیا۔ عرفی کیسا ملحد تھا جو نہ تو رسول اللہ کی نبوت و رسالت کا منکر تھا نہ حضرت علیؓ اور ان کے بعد کے اماموں کی امامت کا۔

کیا کوئی ملحد نعت رسول میں یہ کہہ سکتا ہے:

ہر زہ مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحراست
ہشدار کہ رہ برسرِ تیغ است قدم را

.....

اور غیر شیعہ یہ کہہ سکتا ہے:

بکاوشِ مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہند بخاکم کنی وگر بہ تتار

.....

ہند میں دفن کیا جاؤں یا ملکِ تتار میں، مژگاں سے راستہ کھودتے کھودتے گور سے نجف پہنچ ہی جاؤں گا۔ نجف کے بارے میں عام اعتقاد یہ ہے کہ وہاں حضرت علیؓ مدفون ہیں۔ حالانکہ

چوتھی صدی ہجری کے وسط تک کے مورخین طبری اور دیگران کے مدفن کا نجف میں ہونے کا ذکر تک نہیں کرتے۔ طبری کا سال وفات ۳۰۹ھ ہے۔ نجف کا ذکر پہلی بار دیالمہ کے دور میں آیا ہے جو شیعہ تھے اور خلفاے عباسیہ ان کے رحم وکرم پر تھے، جسے چاہتے تخت خلافت سے اتار دیتے، اندھا کر دیتے۔ دسویں محرم کو ماتم کا آغاز بھی انہی کے دور سے ہوا۔ دیالمہ جنہیں بویہہ بھی کہا جاتا ہے۔ ۳۳۴ ہجری میں بغداد کے مالک ہوئے۔ خلیفہ مستکفی باللہ کو معزول اور اندھا کر دیا اور قید (سید امیر علی نیز ابن طباطبا جو ابن طِقطِقہ کے نام سے مشہور، دونوں شیعہ مورخ)۔ بنی بویہہ ۴۴۲ھ تک برسر اقتدار رہے اور بالآخر سلجوقیوں نے ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ نجف میں حضرت علی کا مدفن ہونے کا ذکر دیالمہ کے دور سے پہلے نہیں ملتا، اس تقریب سے کہ کوئی شکاری اپنے کتوں کے ساتھ شکار کے تعاقب میں تھا تو دیکھا کہ کتے ایک ٹیلے (نجف) پر باوصف شکاری کے کہنے پر نہیں چڑھ رہے تھا۔ وہاں موجود ایک عمر رسیدہ شخص نے شکاری کو بتایا کہ یہ جگہ حضرت علیؓ کا مدفن ہے اسی لیے کتے ادھر کا رُخ نہیں کر رہے۔ انہی برسوں میں بلخ (افغانستان) کے شیعہ گورنر کو خواب میں اشارہ ہوا کہ حضرت علیؓ کا مدفن یہیں قریب ہی ہے اور جو جگہ بتائی گئی وہاں عمارت تعمیر کر دی۔ یہ جگہ مزار شریف کہلاتی ہے اور اب وہاں پورا شہر آباد ہے۔ لیکن جو شہرت اور تقدس نجف کو حاصل ہے مزار شریف کو حاصل نہیں ہو پایا۔ نجف، نجف اشرف کہلایا۔ اقبال کا شعر ہے:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

---

حضرت علیؓ کے مدفن کے بارے میں قبل ازیں کئی متعدد روایات ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ انھیں اپنی شہادت گاہ مسجد کوفہ میں ہی دفن کر دیا گیا تھا اور یہ بھی کہ کوفہ میں اپنے گھر میں دفن ہوئے اور تیسری یہ کہ میت کو تدفین کے لیے مدینہ لے جایا جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور لے جانے والوں کو قتل لیکن دیکھا کہ میت لے جائی جا رہی ہے تو وہیں دفن کر دیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے انھیں مدینہ پہنچا کر حضرت فاطمہؓ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اللہ یعلم مافی السمٰوات و مافی الارض۔ بالفرض ڈاکوؤں والی روایت درست ہے تو معلوم نہیں مولانا ابوالکلام آزاد کا عنفوان شباب کا یہ شعر برمحل ہے یا بے محل:

گنبد ہے گرد باد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سایبان کی

---

نجف کے حوالے سے عرفی کا جو شعر نقل ہوا ہے اس قصیدے کا ہے جس کا مطلع ہے:

جہاں بگشتم و دردا کہ ہیچ شہر و دیار
نیا فتم کہ فروشند بخت در بازار

یعنی سارا جہان گھوم پھرا، افسوس کوئی شہر کوئی دیار ایسا نہیں پایا، جس کے بازار میں بخت بکتا ہو۔ پورا قصیدہ شاعرانہ معجزہ کاری کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کا جواب کہیں کوئی نہیں بطور خاص وہ حصہ جو قصیدہ اشعار پر مشتمل ہے۔ جن میں اس تلمیذ الرحمٰن نے متناقض و متضاد امور کو یکجا کر کے کمال کر دکھایا ہے:

بزورِ بازوے پُر نفع کاسبان ضعیف
بچینِ ابروے بے وجہ خواجگان کبار
بآں دروغ کہ فرہاد ازاں شہادت یافت
بآں ترانہ کہ منصور را کشید بہ دار
بہ غم فروشیِ آسودگان شکوہ طراز
بتازہ روئیِ پژمردگانِ شکر گزار
بشیوہ دانیِ شہر و بہ سادہ روئیِ دہ
بہ نخل بندیِ کشت و بہ خوشہ چینیِ کار
بہ تنگنائے گریباں بہ وسعتِ دامن
بہ خاکساریِ کفش بہ نخوت دستار

.....

قسم ہے ان ضعیف مزدوروں (روزی کمانے والوں) کے پُر نفع زور بازو کی اور قسم ہے اس تمکن کی جو ثروت مند اور مقتدر اصحاب کے ماتھے پر ہوتی ہے۔ قسم ہے اس جھوٹ کی جس کے سبب فرہاد کو شہادت نصیب ہوئی، قسم ہے اس نعرے (اناالحق) کی جو منصور کو دار پر لے گیا، قسم ہے آسودہ حالوں کی نمائش غم فروشی اور شکوہ طرازی کی قسم ہے ان مفلس پژمردہ لوگوں کی تازہ روئی اور شکر گزاری کی، قسم ہے شہر میں رہنے والوں کے ہتھکنڈوں اور دیہاتیوں کی سادگی کی اور قسم ہے زمیندار کی اپنے کھیت کی نخل بندی اور خوشہ چینوں (گرے پڑے خوشے اٹھانے والے) کے کام کی، قسم ہے تنگیِ گریبان اور دامن کی وسعت کی، قسم ہے جوتیوں کی خاکساری اور دستار کی نخوت کی۔

قصیدہ اشعار تو اور بھی ہیں صرف وہی نقل کیے جو یاد رہ گئے۔ اقبال نے یونہی تو نہیں کہہ دیا:

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

.....

اقبال نے جو کہا اس میں نہ مبالغہ ہے نہ غلو۔ واقعی عرفی چند الفاظ میں ایسا نقشہ کھینچ کے رکھ دیتا ہے کہ جو نثر میں بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔ عید کا دن ہر کسی کے لیے عیش و نشاط کا دن ہے۔ شاہ ہو یا گدا ہر کوئی حسب توفیق میسر نعمتوں سے متمتع ہوتا ہے۔ بزبان عرفی:

صباحِ عید کہ در جلہ گاہ ناز و نعیم
گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

.....

یعنی عید کی صبح ہر کوئی دستیاب نعمتوں پر اپنی جلہ گاہ میں نازاں و فرحاں نظر آتا ہے۔ گدا اپنی نمدے کی ٹوپی ٹیڑھی اور بادشاہ اپنا تاج سر پر ٹیڑھا کر رکھتا ہے۔ فخر و انبساط اور

سرشاری میں شاہ اور گدا برابر ہو جاتے ہیں۔ ہے کوئی اور شاعر جس نے روزِ عید کا ایسا نقشہ کھینچا ہو۔ یاد آئے کو تو غالب کا اسی ضمن میں یہ شعر یاد آ رہا ہے:

عید است و نشاط و طرب و زمزمہ عام است
مے نوش کنہ بر من اگر بادہ حرام است

---

لیکن جب سے عرفی کا شعر پڑھا ہے کوئی عید ایسی نہیں گزری عرفی کا شعر یاد نہ آیا ہو۔ عرفی کا شعر مطلع ہے اس قصیدے کا جو اس نے جہانگیر جب وہ شہزادہ تھا کی مدح میں کہا، اسی کے دو شعر یہ بھی ہیں:

نہ گفت و من بشنیدم ہر آنچہ گفتن داشت
کہ در بیاں نگہش کرد بر زباں تقدیم
بش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت
فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

---

یعنی اس (شہزادہ) نے کچھ نہیں کہا اور میں نے سن لیا جو وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اس کی نگاہ نے اس کی زبان پر پہل کر دی تھی۔ جب زبان کی باری آئی تو سامعہ کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈوب گیا۔

عبدالرحیم خانخاناں کے دربار سے منسلک اور خانخاناں کے انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر بھی وہ ہر وہ شہر اور ہر وہ دیار ڈھونڈتا رہا، جس کے بازار میں بخت بکتا ہو۔ سیماب صفت روح زر و مال سے قرار نہیں پاتی۔

دریں ماتم سرا با مصلحت دانے مصاحب شو
کہ در بازار ہا می خندد و در خانہ می گرید

---

اس ماتم سرا میں کسی مصلحت داں کا مصاحب بن جاؤ جو بازاروں میں قہقہے مارتا ہے اور گھر جا کر بھیتر بھیتر روتا ہے۔

عرفی عین عالم جوانی میں بمر چھتیس سال لاہور میں فوت ہوا اور وہیں دفن بھی ہوا۔ تیس سال بعد ایک ثروت مند معتقد نے اس کا جسد خاکی نجف لے جا کر دفن کر دیا۔ یہی اس کی آرزو بھی تھی۔ ہو سکتا ہے دلی و لاہور کے مقابلے میں خنک تر شہر شیراز نہ جا پانے کا غم جان لیوا ثابت ہوا ہو۔ اس کے محسن و مربی ابوالفتح گیلانی بھی جو اکبر کے نورتنوں میں شامل تھے نہیں جا پا سکتے تھے۔ شاہ طہماسپ صفوی ۹۷۴ھ میں گیلان پر قابض ہوا اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے والد مولانا عبدالرزاق کو گرفتار کر کے زنداں میں ڈال دیا اور وہ اسی حالت میں فوت بھی ہوئے۔ ان کے چار فرزند حکیم مسیح الدین ابوالفتح، نجیب الدین، نورالدین اور لطف اللہ نے ہندوستان کی راہ لی۔ عرفی بھی انہی کے ساتھ آیا اور شریف آملی بھی جس نے نقطویہ کا ہندوستان میں سلسلہ قائم کیا اور کئی دوسرے بھی۔

علی عباس جلالپوری نے حروفیہ اور نقطویہ کو گمراہ اور بے دین ٹھہرایا ہے۔ کافر گری اور فتویٰ وہی مفتیوں کا کام ہے، ایک فلسفی یا فلسفہ نگار ایسا کرتا ہے تو اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے۔ خود بھی شیعہ تھے لیکن مارکسزم کی طرف میلان نے ادھر ادھر دیکھنے سے

محروم کر رکھا تھا۔ حروفیہ اور نقطویہ بھی شیعہ تھے اور اثنا عشری لیکن علی عباس جب تصوف کو ہی خلاف دین باور کرتے تھے تو انہیں کیوں نہ کرتے۔ تصوف بھی ان کے نزدیک وحدت الوجود تک محدود تھا، معلوم نہیں اس حقیقت سے لاعلمی کا نتیجہ تھا یا چشم پوشی کا کہ شاہ نعمت اللہ اثنا عشری صوفی جن کے سلسلۂ نعمت اللہیہ سے وابستہ افراد آج بھی ایران میں لاکھوں کی تعداد موجود ہیں، وحدت الوجودی تھے اور صاحب دیوان شاعر بھی:

جام و بادہ ہر دو ہمرنگ آمدند
من نہ دانم ایں کدام است آں کدام

.....

جلیل القدر فلسفی شیخ صدر الدین شیرازی (ملاصدرا) بھی اثنا عشری تھے۔ یعقوب کلینی کی الکافی کے توضیحی و تشریحی حواشی لکھے۔ 'مفاتیح الغیب' میں عمر خیام کی رباعیات نقل کرتے ہوئے عمر خیام کو خبر الباہر اور بحر الزاخر کہا، تصوف و عرفان میں شیخ اکبر ابن عربی کے پیرو تھے۔ قلعہ کہک میں نظر بندی کے دوران میں شیخ اکبر ابن عربی کے افکار کا درس دیتے رہے۔ شاہان صفویہ کو مرشد ان کامل نہیں سمجھے تھے، ملا باقر مجلسی، ملا شمسائے گیلانی سرکاری مُلا ان کے بھونپو جن کی مساعی کے نتیجے میں زندگی زنداں میں گزری۔ ان لوگوں نے ایران میں تعصب، تنگ نظری اور گھٹن کی وہ فضا پیدا کر رکھی تھی کہ بیسیوں اہل فضل و کمال وقتاً فوقتاً ہندوستان کا رُخ کرتے رہے تاکہ کھل کر سانس لے سکیں ایران سے ہندوستان آنے والوں میں ایک شاعر علی قلی سلیم میں تھا۔ اپنی آمد کی وجہ یہ بتائی:

نیست در ایراں زمیں سامانِ تحصیلِ کمال
تا نیامد سُوے ہندوستاں حنا رنگیں نہ شد

.....

حکیم ابوالفتح گیلانی بھی انہی اہل فضل و کمال میں شامل تھے۔ اکبر نے ان کی انتظامی صلاحیتوں کو دیکھ کر پہلے بنگال کا گورنر لگایا جب یوسف زئیوں کے ساتھ جنگ ابوالفضل قتل ہوا تو انہیں حسن ابدال بھیج دیا تاکہ یہاں سے ہزارہ اور ملک یوسف زئی (صوابی، مردان، سوات دیر) پر نظر رکھی جا سکے۔ ورنہ یہاں آنے، وفات پانے اور دفن ہونے کی وجہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ مرزا بیدل کے سوانح میں بھی حسن ابدال کے سفر کا ذکر موجود ہے۔ جس سے اس جگہ کی جغرافیائی، انتظامی اور دفاعی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے بھی حکیم ابوالفتح گیلانی کو یہ تخصیص حاصل ہے کہ ابوالفضل کی پُرشکوہ نثر (رقعات) کو چھوڑ کر عام بول چال کی زبان اپنے رقعات (مکاتیب) میں اختیار کی۔ غالب نے بھی اپنے مکاتیب میں اُسی طرز کی پیروی کی۔ غالب کے زمانے میں اردو میں بھی ابوالفضل کی پیروی کی جا رہی تھی۔ غالب اس طرز کا موجد تو نہیں بہرحال اردو میں اولیت اسے ضرور حاصل ہے۔ معذرت کے ساتھ:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

☆☆☆☆☆

# فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے [عزیز گرامی شاہد حمید (مرحوم) کی یاد میں]

دوشیزۂ کتاب سے عشق خوش نصیبوں کا مقدر کہلاتا ہے، اس کا حسن و جمال کبھی ماند نہیں پڑتا اور اس کا وصف خاص یہ ہے کہ بے وفائی کرنا اس کی سرشت نہیں۔ یہ اپنے چاہنے والوں کے سامنے مسکرا کر بے نقاب ہوتی ہے اس کے بندِ قبا کھولنے میں دیر نہیں لگتی لیکن یہ پورے طور پر ہر شخص کو اپنا معنوی چہرہ نہیں دکھاتی۔ کتاب تنہائی میں کسی چہچہاتے پرندے کی طرح زمزمہ پیرا ہوتی ہے:

ہمنشینی اگر کتاب سے ہو
اس سے بڑھ کر کوئی جلیس نہیں

.....

اس کی غمزہ ادائی اور عشوہ طرازی ہر صاحب دل کو بھاتی ہے، یہ کبھی نگاہوں کے سامنے جلوہ ساماں ہوتی ہے اور کبھی اپنے چاہنے والے کے دل و دماغ و مسحور کرتی ہے اس کی کتنی ادائیں ہیں جن کا کوئی نام نہیں۔ یہ زندگی بھر قاری کی ہمسفر رہتی ہے، کتاب کا حرف حرف جیتا جاگتا ہے، سانس لیتا محسوس ہوتا ہے، قاری کے لب پر ایک ہی دعا رہتی ہے کہ وہ کبھی اس سے جدا نہ ہو، اس کے نہاں خانۂ دل سے یہی ایک صدا آتی ہے کہ:

وہ حرف حرف مری روح میں اُتر جائے
میں کم نظر ہوں مری عاقبت سنور جائے

.....

اب سوال یہ ہے کہ اس عہد بے تعبیر میں اسے کہاں سے حاصل کیا جائے۔ اسے پانے کے لیے کس کنوئیں میں جھانکا جائے۔ آواز کی بازگشت گوشِ وجدان سے سنی۔ یہ آواز تو پہلے بھی سنائی دی تھی، مجھے یاد آیا کہ دریائے جہلم کے کنارے ایک بے سروسامان اور بے یارومددگار نوجوان شاہد حمید نے گوشۂ بازار میں کتاب گھر بنایا جس کا نام جہلم بک کارنر رکھا۔ مختصر سی دکان مگر آن بان ایسی کہ ہر گزرنے والے کے قدم رک جاتے۔ دیکھا تو یہ میرے ہونہار شاگرد ہیں، مجھے دیکھتے ہی دکان

حسن عسکری کاظمی

سے باہر آئے، سر جھکا کر پزیرائی کی اور کہا کہ دعا کیجیے کاروبار کا آغاز کیا ہے، میں بہت خوش ہوا کہ ملازمت کا طوق پہننے سے تجارت کہیں بہتر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ماہ نو میں میرا مضمون مرتضیٰ برلاس کی کتاب ''شیشۂ کرب'' چھپا مگر وہ جریدہ مجھے نہیں ملا تھا۔ شاہد حمید سے پوچھا وہ کہنے لگے ادب کا مطالعہ کم ہو چلا ہے مگر ڈائجسٹ کی مانگ ہے یہ کہہ کر انھوں نے ماہ نو میری طرف بڑھایا اور بتایا صرف دو میں سے ایک خریدا گیا یہ ایک آپ کی نذر ہے، میں نے شکریہ ادا کر کے ماہِ نو کی قیمت ادا کرنا چاہی، شاہد حمید سے کہا تحفے کی قیمت حرفِ دعا ہے، ہم ابھی یہ مکالمہ کر رہے تھے کہ جہلم کینٹ سے دو تین نوجوان لڑکیاں آئیں، ایک نے شاہد حمید سے عمران ڈائجسٹ کی دس بارہ کاپیاں طلب کیں، رسالہ ختم ہو چکا تھا وہ پریشاں ہوئی کہ میری سالگرہ ہے اور کل مجھے مہمانوں کو عمران ڈائجسٹ کا تحفہ دینا تھا، اب کیا ہوگا، شاہد حمید نے کہا رقم دیجیے اور کل بعد دوپہر رسالے منگوالیں، لڑکی نے رقم دی، میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ انتظام کیسے ہوگا۔ سَر یوں ہوگا کہ میں فون کروں گا اور لاہور سے یہ میگزین بذریعہ بس آ جائیں گے۔ اس سلسلے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ کاروبار کرنے میں مشاق اور مستقبل بینی میں اپنی مثال آپ تھے۔

مولانا حسرت موہانی اور شاہد حمید میں ایک مماثلت پائی جاتی ہے کہ دونوں تجارت سے روزی کماتے رہے، حسرت موہانی کتابوں کا ٹرنک سر پر رکھ کر بیچنے نکلتے۔ کتابوں کے علاوہ رسائل اور اخبار بھی فروخت کیے۔ حسرت موہانی شریف النفس اور خوددار آدمی تھے۔ کسی امیر سے کبھی رعایت کے طلبگار نہیں ہوتے، تندور پر بیٹھ کر ''آ نے روٹی دال مفت'' پر بھی گزر بسر کی، شاہد حمید گورنمنٹ انٹر کالج جہلم میں پڑھتے رہے، اپنے اساتذہ کا بہت احترام کیا، قدرت نے بہت نوازا اور کتابوں سے دوستی ہوئی تو رزق کے دروازے کھل گئے۔ عہدِ موجود میں کتاب سے رغبت میں کمی دیکھی یہ جانتے ہوئے کہ اب کتاب کا مطالعہ کرنے والے نہ ہونے کے برابر رہ گئے مگر انھوں نے اشاعتِ کتب کا بیڑا اٹھایا اور سب کو حیران کر دیا کہ جہلم جسے پاکستان کا بازوئے شمشیر زن کہا گیا اُسے ایک اور نیا تعارف دلایا کہ جہلم ایک ایسا اشاعت گھر ہے جہاں ہر شعبۂ علم و ادب کی کتاب چھاپی جا رہی ہے اور ہر کتاب کی شکل و صورت دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاہد حمید کا ذوق جمالیات اپنی انفرادیت کا پرچم بلند رکھے ہوئے ہے، جس کے نتیجے میں ذوقِ مطالعہ فروغ پانے لگا ورنہ اس سے پہلے لوگ بے نیازانہ

گزرتے رہے مگر خدا شاہد ہے کہ شاہد حمید اور ان کے فرزندان باتمکین گگن اور امر کی گواہی سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ میدان عمل میں یہ دو شہسوار شاہد حمید کی ریاضت اور شفقت کا حاصل ہیں۔ ہم نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے کہ ہر طرف خاک اُڑتی تھی۔ قاری کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔ اوراق منتشر اور روشنائی مدھم ہو چلی تھی:

قاری نہ ملا اور ادھر وقت کی دیمک
چٹ کر گئی ایسا بھی زمانے میں ادب تھا

.....

پاکستان کو نو دولت مندوں اور ان کی ناخلف اولاد نے "باورچی خانہ" بنا دیا جہاں انواع و اقسام کے کھانے تیار ہوتے، ریستورانوں میں بیٹھنے کو جگہ ملنا محال تھی، لذت کام و دہن میں مبتلا نئی نسل کو بیچاری کتاب مہنگی لگنے لگی، گھروں میں اعلیٰ فرنیچر، کمخواب کے پردے، صوبہ کم بیڈ اور ڈائننگ ٹیبل پر عمدہ اور لذیذ کھانے، نت نئی تراکیب سے بھنے ہوئے تیتر، بٹیر یا ہرن کی ران سے گوشت اتارا جاتا اور اپنی خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا جاتا مگر گھر میں کتاب کے لیے کوئی جگہ دستیاب نہیں، مجھے یاد ہے کہ ہم تین افراد حسن رضوی، سعادت سعید اور یہ خاکسار وہلی گئے جہاں ہم محترم شباب ردولوی کے ہاں ٹھہرے، پورا گھر کتابوں سے بھرا ہوا تھا، ہمیں یہ کہنا پڑا کہ ہمارے ہاں سب نعمتیں ہیں مگر عظیم نعمت کتاب سے گھر کے گھر خالی ہیں۔

شاہد حمید کو یہ احساس تھا کہ لوگوں میں کتاب خریدنے اور پڑھنے کا مزاج نہیں، انھوں نے جہلم سے نکل کر لاہور، کراچی، پشاور اور کوئٹہ کے علاوہ فیصل آباد، گجرات، گوجرانوالہ وغیرہ میں کتاب فروشی کے لیے موثر اقدام کیا، قلمکاروں کا عملی تعاون حاصل کیا، شاہد حمید نے اپنی زندگی میں حرکت میں برکت پر یقین رکھتے ہوئے جہلم میں اقبال لائبریری کے سامنے وسیع و عریض شو روم بنایا جسے دیکھنے کے لیے اہل علم و فن آتے ہیں اور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ ایسا شو روم کسی بڑے سے بڑے شہر میں بھی نہیں۔

آج برخوردار گگن شاہد اور امر شاہد اپنے والدِ گرامی کی علمی و ادبی وراثت کے نگران اسی جذب و شوق کے ساتھ کاروبار ہنر کو آگے بڑھا رہے ہیں، شاہد حمید کا لگایا ہوا پودا ایک تناور درخت بن چکا ہے، اس کی سبز چھاؤں میں خنکی دل کی طمانیت کا سبب بنتی ہے، نامور ادیب، شاعر محقق، دانشور اور دانش جُو سے ان کا رابطہ محبت قائم ہے۔ میں دل کی گہرائی سے دعا گو ہوں کہ وہ شاہد حمید کی امانت کے محافظ بن کر جہلم بک کارنر کو دائمی عزت بخشنے کا سبب بنیں گے۔

☆☆☆☆☆

# تسنیم کوثر کے افسانوں کے مجموعے ''چبھن'' پر ایک نظر

تسنیم کوثر کی دو کتابیں حال ہی میں موصول ہوئیں۔ ایک افسانوں کا مجموعہ ''چبھن'' اور دوسرا ان کی شاعری کا مجموعہ ''سرگوشی''۔ دونوں کا مطالعہ کر لیا، پہلے سرگوشی پر لکھنے کا ارادہ کیا مگر پھر سوچا کہ سرگوشی کے بعد چبھن کا احساس تکلیف دہ ہو گا اس لیے پہلے چبھن برداشت کر لی جائے، پھر سرگوشی کر کے چبھن کا ازالہ ہو جائے گا۔

جملۂ معترضہ کی معذرت۔ تسنیم کوثر کا نام کوئی اجنبی نہیں، ایک آدھ ادبی محفلوں میں ملاقات بھی رہی ہے، ان کے سفرنامے بھی پڑھتا رہا اور لطف لیتا رہا۔ اُن کے افسانے بھی شاید کہیں پڑھے ہوں مگر بیک وقت ان کے بائیس افسانے پڑھے تو بڑا لطف آیا اور یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ مختصر افسانہ لکھتی اور اپنے موضوع کی طرف گھسن گھیریاں کرتی نہیں بلکہ براہِ راست آتی ہیں ورنہ کتاب کے ۱۱۶ صفحات میں بائیس افسانے سمیٹنا آسان نہ تھا۔ ان کے افسانے نسوانی نہیں اگرچہ ان کے افسانوں کے موضوع نسوانی اور نسوانی مسائل سے جڑے ہوئے ہیں، انھوں نے ان افسانوں میں ازدواجی زندگی کی ناکامی کا ذمہ دار محض مرد یا شوہر کو نہیں ٹھہرایا بلکہ عورت کو بھی ٹھہرایا ہے۔

ان کے افسانوں کا قاری افسانہ شروع کرتے ہی اس میں بنی ہوئی کہانی کی گرفت میں آ جاتا ہے، اور پھر مختصر جملوں یا مکالموں کی کشش میں آخر تک پڑھتا چلا جاتا ہے، تجسس اسے کوئی بھی افسانہ انجام تک لائے بغیر چھوڑنے نہیں دیتا۔ اگرچہ

نسیمِ سحر

ان کے کچھ افسانے افسانے کی روایتی بُنت میں نہیں آتے اور انجام تک پہنچ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاید کچھ تشنگی رہ گئی ہے مگر ایسا ان کے صرف دو تین افسانوں میں ہی ہوا ہے جہاں موضوع کا بیانیہ حاوی ہو گیا ہے مگر تسنیم کوثر یہ نہیں چاہتی کہ افسانہ تو مکمل ہو جائے مگر جو پیغام وہ قاری کو دینا چاہتی ہیں وہ ادھورا رہ جائے چنانچہ زیادہ تر افسانوں میں انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی بات کہی اور قاری تک وہ پیغام پہنچایا ہے جو ان کے ذہن میں تھا۔

یہ کتاب ادارہ اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی جزوی مالی معاونت سے شائع ہوئی۔ ناشر اردو اکیڈمی پاکستان، لاہور۔ پہلی بار ۲۰۱۷ میں شائع ہوئی قیمت ۳۰۰ روپے۔ مصنفہ نے کتاب کا پہلا انتساب ''اپنی جنت'' کے نام کیا ہے، جبکہ انتساب ثانی کر کے اپنی کتاب کا تمام تر موضوع اجاگر کر دیا ہے کہتی ہیں: ''سمجھوتے کی چادر اوڑھ کے گھر کو جنت بنانے والی ہر عورت کے نام''۔ ان کے تمام افسانے اسی عورت کے نام اور اسی کی داستان ہیں۔

بشریٰ رحمٰن کہتی ہیں ''تخلیقی ذہن رکھنے والوں کو کہیں کہانی نظر آتی ہے تو وہی اس کے اندر اپنے تخلیقی کردار ڈال کر اسے افسانہ بنا دیتے ہیں۔''

ان کے افسانہ نگاری کا آغاز شاعری کے بعد ہوا غالباً شاعری ان کے جلتے سلگتے موضوعات کا احاطہ نہ کر سکی۔ ان کا عمیق مشاہدہ اور حساس فطرت نے انہیں معاشرے کی سلگتی ہوئی حقیقتوں اور مسائل پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور ان کی قلمی زرخیزی نے ان موضوعات کو ادبی رنگ میں افسانے کے روپ میں پیش کیا۔

بشریٰ رحمٰن نے تسنیم کوثر کی افسانہ نگاری میں بجا طور پر پانچ خوبیاں گنوائی ہیں۔ اختصار، زبان و بیان کا اسلوب، کردار نگاری، افسانوں کی عمدہ بنت، اور اہم ترین خوبی یہ کہ ہر افسانے کا مرکزی کردار عورت ہے جس کی ذہنی اور روحانی چبھن کو تسنیم کوثر نے اپنے افسانوں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

یونس جاوید کہتے ہیں کہ تسنیم کی سب کہانیاں مرد حاوی، معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کا مشاہداتی عمل اس قدر مکمل ہے کہ محسوس ہونے لگتا ہے یہ مشاہدہ نہیں تجربہ ہے، یہی مشاہدے کی حساسیت کی تکمیل ہے، اس کا اختصار اس قدر متاثر کرنے والا کہ ہر جملہ تاثیر سے لبالب ہو جاتا ہے، وہ لفظ ضائع نہیں کرتی۔

☆☆☆☆☆

# توصیف تبسم: شخصیت و فن

زیرِ نظر کتاب اکادمی ادبیات پاکستان کی سیریز ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے تحت ''ڈاکٹر توصیف تبسم: شخصیت و فن'' کے عنوان سے حال ہی میں منظرِ عام پر آنے والی کتاب ہے۔ مذکورہ حوالہ جاتی کتاب کے مرتب و مصنف ڈاکٹر شیر علی ہیں اور بلا شبہ یہ کتاب اردو ادب کے منفرد اور ممتاز شاعر، نقاد، محقق اور دانش ور کا بڑی حد تک ایک جامع تعارف نامہ ہے۔ اس کے پیش کار ڈاکٹر شیر علی خود بھی جواں سال محقق اور نقاد ہیں۔ انھوں نے شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ''برطانیہ میں اردو شاعری'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ تحریر کر کے پی ایچ ڈی اُردو کی ڈگری حاصل کی ہے۔ کتاب کا پیش نامہ چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان ڈاکٹر یوسف خشک نے تحریر کیا ہے جب کہ پیش لفظ میں اس کے مرتب و مصنف نے لکھا ہے کہ'' ڈاکٹر توصیف تبسم کے فکر و فن پر کچھ تحریر کرنا کسی سعادت سے کم نہیں'' اور یہ کہ وہ ایسا کر کے دراصل زیرِ بحث شخصیت سے اپنی نیاز مندی کا اظہار کر رہے ہیں۔

کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر باب میں متعدد ذیلی ابواب قائم کیے گئے ہیں - باب اول ڈاکٹر صاحب موصوف کے سوانح حالات و واقعات پر مشتمل ہے جس میں ان کی پیدائش، خاندان، مہاجرت، تعلیم، ملازمت، ازدواجی زندگی اور ادبی سفر کا جامع الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ باب دوم میں ڈاکٹر توصیف تبسم کی شاعری کے مختلف گوشوں اور زاویوں پر ہلکے پھلکے انداز و اسلوب میں بات کی گئی ہے جو کلامِ توصیف کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شاعری پر غزل گو شاعر کے طور پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ ان کی شاعری کی دیگر اصناف یعنی نظم نگاری، حمد، نعت، منقبت، سلام اور

نثار ترابی

بچوں کی شاعری پر مختلف اہلِ قلم کے متنوع مضامین یکجا کر کے انھیں شاملِ کتاب کیا گیا ہے، جن سے ڈاکٹر صاحب کی شاعری کی مختلف جہتیں روشن ہو جاتی ہیں بلکہ قاری کو حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی شخصیت میں قدرت نے کس قدر وسیع پیمانے پر ادبی چراغ اور قمقمے سمائے ہیں۔ باب سوم بہت اہم ہے جس کا عنوان تحقیق و تنقید رکھا گیا ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر توصیف تبسم کے تحقیقی مقالے ''منیر شکوہ آبادی: احوال و آثار'' پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ منیر شکوہ آبادی کا تعلق انیسویں صدی کے باکمال شعراء میں ہوتا ہے، جن کے قدرت بیان سے انکار ممکن نہیں۔ اس مقالے میں توصیف تبسم نے اپنے ممدوح منیر شکوہ آبادی کی شعری روایت، فنی محاسن، سوانح اور شخصیت کے نقش اجاگر کیے اور ان کی فنی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی قابلِ ستائش کوشش کی۔

دوسرے ذیلی عنوان ''یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا'' (جو کہ ڈاکٹر توصیف تبسم کی کتاب کا عنوان بھی ہے) کے تحت ڈاکٹر صاحب موصوف کے غزل کے تصورِ عشق، عشقِ حقیقی، عشق مجازی، معاملہ بندی جیسے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ درحقیقت اس کتاب میں ڈاکٹر توصیف تبسم نے ہندوستان میں ہونے والے مختلف سانحات کے اثرات کو غزل کے ساتھ جوڑا اور بقول مصنف، وہ سانحات غزل پر کس طرح اثر انداز ہوتے رہے، ان کا کما حقہٗ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح ہجرت، سقوطِ ڈھاکہ، بھٹو کی پھانسی جیسے اہم واقعات کی روشنی میں اردو غزل پر فکری اور لسانی اثرات کا مطالعہ بھی زیرِ بحث آ گیا ہے۔

باب سوم کے تیسرے ذیلی باب میں ''خاکہ نگاری اور اقرار حسین شیخ'' جو ڈاکٹر توصیف تبسم کی خاکہ نگاری پر مبنی کتاب ہے، کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ مصنف کے بقول اقرار حسین کے خاکوں میں حقیقت پسندی کا عنصر ملتا ہے اور یہ بات بھی کہ انھیں برمحل اور باموقع بات کو بیان کرنے میں مہارت ہے۔ اس کے ساتھ بعض جگہ وہ جزیات کو تفصیل سے بیان کرنے کا اسلوبیاتی رویہ بھی اپناتے ہیں، جس سے ان کا اسلوب رنگا رنگ ہو جانے کی جھلک سامنے لاتا ہے۔ توصیف تبسم نے ان کے خاکوں میں سادگی، سلاست، روانی، عام فہم زبان، سادہ شگفتہ، انداز اور اظہار کی خوش سلیقگی جیسی صفات کا ذکر بھی ہے اور یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ان کا پختہ اسلوب آغاز سے اختتام تک دلکش انداز میں قاری کے لیے دل چسپی کا باعث بنتا ہے۔ مصنف کے نزدیک خاکہ نگاری پر گہری تنقیدی نظر ڈالنے سے پیشتر نقاد خود بھی فنِ خاکہ نگاری کے گہرے رموز سے آشنا ہو۔ اس باب میں

بھی ڈاکٹر توصیف تبسم بہر طور سرخرو ٹھہرتے ہیں، جنھوں نے اپنی خاکہ نگاری سے ادبی حلقوں اور ناقدین کو اس صنف میں اپنی بھرپور دسترس کے باعث متوجہ کیا۔

باب چہارم متفرق اصناف پر مشتمل ہے جن میں ''بند گلی میں شام'' ڈاکٹر توصیف تبسم کی اپنی یادداشتیں پر مبنی کتاب ہے جو ۲۰۱۰ء میں عکاس پبلی کیشنز اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ یہ ساڑھے تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ بقول مصنف، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی افتادِ طبع کے باعث خود کو شعر و ادب کے وقتی ہنگاموں سے دور رکھا لیکن اپنی تخلیقات کی وجہ سے اردو ادب کے قارئین اور ناقدین کو اپنی موجودگی کا برابر احساس دلاتے رہے۔ یاد نگاری ایک طرح سے اپنے محبوب احباب کو یاد کرنے کا عمل ہے۔ یاد نگاری کے اس عمل میں کھو جانے والے مناظر تازہ کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ بزم آرائیوں، دوستوں کی باہمی ملاقاتوں کو ان کے رویوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، دوسرے لفظوں میں یاد نگاری میں کسی کا بچھڑ جانے والے مقامات کی آرزو کرنا، یا خود کو آواز دینا یا پھر اپنے ہی گزرے ہوئے کل کو پکارنا ہے۔ ڈاکٹر توصیف تبسم کو اپنے طویل ادبی سفر میں بعض معروف اور غیر معروف ادبی شخصیات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے ان تمام ملاقاتی کیفیات کو بڑی خوش اسلوبی، بڑی تہذیب وضع داری اور کمال دیانتداری سے بعد میں آنے والوں کے سپرد کر دیا۔ اس طرح یہ یادداشتیں ان کے اپنے عہد کی اجمالی و تاریخی ادبی تاریخ بن گئی ہیں۔ یہ کتاب سوانح نگاری اور خصوصاً شخصیت نگاری کی جدید روایت میں جہاں تک ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے وہاں تحقیقی نقطۂ نظر سے اس کی اپنی ایک اہمیت ہے کیوں کہ اس میں بعض بڑی ادبی شخصیات کے بارے میں ایسی یادداشتیں اور داخلی شہادتیں محفوظ ہو گئی ہیں جو شاید کہیں اور دستیاب نہ ہو سکیں۔ ڈاکٹر توصیف تبسم کی زبانی پیش کی جانے والی ان یادداشتوں اور داخلی شہادتوں کا پیرائیہ بیان اتنا دلچسپ ہے کہ بیان کردہ حقائق و واقعات پر کہانی کا سا گمان ہوتا ہے۔

''کہاوت کہانی'' کتاب بھی ڈاکٹر توصیف تبسم کا ایک نہایت اہم اور ایک نئے طرز اسلوب کا حامل قابلِ قدر کام ہے جسے ۲۰۰۱ میں نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے شائع کیا۔ اس کتاب میں مختلف کہاوتوں کو کہانیوں کے طرز پر پیش کیا گیا ہے۔

توصیف تبسم نے پہلے سے موجود مختلف کہاوتوں کا انتخاب کیا اور پھر ان کی کہانیوں کو نہایت آسان، عام فہم اور پُر لطف انداز میں ڈھال دیا، جس سے ان کہانیوں کے اسلوب میں ایک نوع کی انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کہاوتوں کے مطالعے سے جہاں ایک طرف لوک دانش کی

تفہیم کے دَروا ہوتے ہیں تو دوسری جانب ان کہاوتوں کے مرکزی کرداروں کے ہاں پائی جانے والی کرداری عظمت اور خصوصاً صاف گوئی کا وصف بھی سامنے آتا ہے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ ان کہانیوں میں کرداروں کی خوبیوں اور خامیوں کو نہایت خلوص کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مختلف انسانی طبقات کی نادانیوں اور دانش کو سچائی کے رُوبہ رُو لایا گیا ہے۔

اس طرح زیرِ نظر کتاب میں ''انتخاب کلام'' کے عنوان کے تحت ۲۰ منتخب غزلیں اور حمد، نعت، سلام، منقبت کے باب میں ان سب اصناف کے بعد چنیدہ نظمیں شامل کی گئی ہیں، جن میں پیش لفظ آگہی، محور، شبِ زادگان، زمستان کی آخری رات، خزاں میں آخری دعا، آخرِ شب، منزل منزل، تخلیق، چمن زادیم، ہتھیلی پہ لکھی نظمیں، ۲۶ دسمبر ۱۹۹۶، کٹھ پتلی، تماشا اور دوشیزگی شامل ہیں۔

اس کلام توصیف کے انتخاب پر ڈاکٹر شیر علی نے خود کو یقیناً ایک نقد و نظر کا حامل مصنف ثابت کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر توصیف تبسم کے وسیع ذخیرۂ کلام سے انتہائی کڑا انتخاب خود مصنف کا اپنا کڑا امتحان تھا جس میں بہر حال وہ خاصے کامیاب ٹھہرے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر توصیف تبسم کا شمار معاصر عہد کے ان معدودے چند اور قابلِ رشک تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال شعرا میں ہوتا ہے جن کا کہا ہوا ہر ہر مصرع انتخاب ہوتا ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ مشکل تو یہ ہے کہ ان کے انتخابِ کلام سے کیا کیا انتخاب کیا جائے اور کیا کیا چھوڑ دیا جائے؟ پھر بھی بات سخن ور اور سخن گوئی کی ہو رہی ہو تو ''لذتِ قلب و روح'' کی خاطر کچھ نہ کچھ اہتمام تو ضروری ہو جاتا ہے لہٰذا کلام توصیف صفت سے چند غزلیہ شعری نمونے بلا تبصرہ آپ کے ذوق کی نذر ہیں:

قرار جاں جسے کہتے ہیں، جاں سے باہر ہے
یہ اک ستارہ، کہیں آسماں سے باہر ہے

ہجوم گریہ! اسے بھی سمیٹ لے کہ یہ اشک
ستارہ وار رہ کہکشاں سے باہر ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا محیطِ دل ترا غم
کہاں سے جاں میں ہے شامل، کہاں سے باہر ہے

یہ دل و جاں کی اداسی نہیں دیکھی جاتی
چاند نکلا ہے سرِ شہرِ وفا آخرِ شب

ہم ہی گمنام رہے ورنہ تری محفل میں
دل پہ جو زخم لگا پھول ہُوا، آخرِ شب

افق پہ بہتا ہوا خوں سیہ پڑا تو نہیں
کوئی چراغ جلا لو، لہو کے ہوتے ہوئے

بلا سے برگ و ثمر کچھ نہ ہو، کچھ ایسا ہو
زمین زہر نہ اگلے، نمو کے ہوتے ہوئے

گردش میں رہیے بولتے گاتے لہو کے ساتھ
یعنی قدم نہ ذات سے باہر اٹھائیے

توصیفِ فن یہی ہے کہ اس دل کی خاک سے
پیکر خود اپنے قد کے برابر اٹھائیے

منتظر رستوں پہ کھلتے آشنا چہروں کے پھول
اے گزرتے وقت! وہ تصویر رکھ دی ہے کہاں

..................................

پل پل روپ دکھاتی، جاتی دنیا میں
ایک نظر کی فرصت ہے، کیا کیا دیکھیں

اس حصے کے بعد ڈاکٹر توصیف تبسم کے بارے میں معاصرین کی آرا یکجا کر کے انھیں مرحلہ وار شامل کیا گیا ہے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، محبّ عارفی، ڈاکٹر خورشید رضوی، پروفیسر فتح محمد ملک، ضمیر علی بدایونی، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر رشید امجد، جلیل عالی، آفتاب اقبال شمیم، پروفیسر انور مسعود، شوکت واسطی، ڈاکٹر انور سدید، نثار ترابی (راقم الحروف)، سید حامد یزدانی، ڈاکٹر نجیبہ عارف، ڈاکٹر یونس خیال، ڈاکٹر ارشد حمید، خورشید ربانی، شاہد ماکلی، ڈاکٹر عابد سیال، نوید صادق، ارشد نعیم اور ڈاکٹر عزیز احسن جیسی نامور ادبی شخصیات نے مختلف پہلوؤں سے (جن میں ذاتی تعلق داریاں بھی شامل ہیں)، ڈاکٹر توصیف تبسم کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے تعلق سے عمدہ گفتگو کی ہے۔

آخر میں ''ماحصل'' کے موقف کے تحت پوری کتاب کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر شیر علی نے بجا تحریر کیا ہے کہ ڈاکٹر توصیف تبسم کی غزل میں حیات و کائنات کی بے ثباتی اور رائگانی کا محض ذکر ہی نہیں ملتا بلکہ وہ اپنی غزل کے ذریعے تحلیل و تجزیہ کی اگلی منزلوں سے بھی اپنے قاری اور ناظر کو روشناس کراتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ شعر کی تجریدی جمالیات کا سہارا لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی نظمیں ان کی ذات اور تخلیق کے ایک نئے پہلو اور ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی پوری ایک منظوم دنیا بسائی ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے ڈاکٹر توصیف تبسم کے فکر و فن پر ایک سنجیدہ مطالعہ پیش کیا جانا معاصر ادب کی ایک اہم ضرورت تھا۔ ہمیں دلی مسرت ہے کہ ڈاکٹر شیر علی نے ممکنہ تہذیبی ریاضت اور تحقیقی جاں فشانی سے کام لیتے ہوئے یہ اہم ادبی فریضہ سرانجام دیا ہے جس پر وہ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔

## کتابیات

''توصیف تبسم شخصیت و فن'' شیر علی (ڈاکٹر)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۲۲

☆☆☆☆☆

# فلسفۂ شاعری

فلسفہ کسی بھی شے کے بارے میں حتمی سچائی تک پہنچنے کا علم ہے چاہے اس کا تعلق موجود سے ہو یا لاموجود سے۔ شاعری کے حوالے سے کسی قسم کے حتمی نتیجے تک پہنچنے سے جس طرح سائنس ابھی ہچکچاہٹ کا شکار ہے اسی طرح کسی حد تک فلسفی بھی اس پر بات کرنے سے ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ فلاسفی آف آرٹس میں بھی زیادہ تر مصوری، تھیٹر اور میوزک پر مباحث ملتے ہیں لیکن شاعری پر کم بات کی گئی ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شاعری بیک وقت انفرادی معاملہ بھی ہے اور اجتماعی بھی، داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ حتیٰ کہ ذاتی بھی ہے اور غیر ذاتی بھی۔ فکری بھی ہے اور جذباتی بھی۔

انسان باقی جانداروں سے اس لیے افضل ہے کہ ان سب سے زیادہ اظہار کی قدرت رکھتا ہے اور شاعر اس لیے دوسرے انسانوں سے افضل ہے کہ یہ باقی سب انسانوں سے زیادہ اظہار کی قدرت رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ شاعر کا اظہار یعنی شاعری باقی فنونِ لطیفہ سے زیادہ مؤثر اظہار پر بھی قادر ہے اور اس کے ابلاغ پر بھی۔ شاعری کے معلوم اور نامعلوم کے بیان پر فلسفہ بالعموم اور سائنس بالخصوص مخمصے کا شکار نظر آتے ہیں کہ انہیں خارجی منطق اور ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ میرے نزدیک یہ شاعری کا وہ دائرۂ کار ہے جہاں تک کسی دوسرے علم کی رسائی ممکن نہیں۔ نامعلوم کے حوالے سے اسے مبالغے اور غیر منطقی بیان کے باعث اس کے بیان کی سچائی پر سوال اٹھایا جاتا ہے جو درست نہیں کیونکہ شاعری کی سچائی کو طے شدہ منطقی ادراک کے میزان پر پرکھنے کے بجائے، محسوسات اور خیال کے اظہار کی سچائی کے میزان پر پرکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ شعری استدلال میں کامیابی شاعر اور نقاد کے درمیان طے کرنے کی بات ہے۔ یہ فلسفے یا سائنس اور شاعری کے درمیان طے کیا جانے والا قضیہ نہیں ہے۔ جہاں تک نامعلوم کے بیان کا تعلق ہے تو اسے محض اس لیے رد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ابھی ماورائے عقل و فہم ہے بلکہ چونکہ اس کا مآخذ انسانی متخیلہ ہے اور متخیلہ کی حدود طے نہیں کی جاسکتیں لہٰذا اس کے شاعرانہ اظہار کے لامحدود ہونے پر سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔ شاعری کو یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ یہ بیک وقت پڑھی، سنی اور پرفارم بھی کی جاسکتی

فرحت عباس شاہ

ہے جبکہ تصویر سنی نہیں جاسکتی اور موسیقی کو دیکھا نہیں جاسکتا۔ اس کے جادوئی ہونے یا اثر پذیر ہونے کا سکوپ بھی باقی تمام فنون سے اسی لیے زیادہ ہے کہ اس کا حسیاتیسکوپ یا پھیلاؤ دوسرے فنون سے زیادہ ہے۔ بعینہٖ شاعری اپنے اندر فلسفے، طبیعات اور مابعد الطبیعات کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے علوم کے موضوعات کو سمونے اور سوال اٹھانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ شاعری خاص طور پر لطیف ترین انسانی احساسات کے بارے معلومات فراہم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

شاعری ایک ایسا آزاد مظہر ہے جو کئی دفعہ طے شدہ ضابطوں اور ہیئتوں کو توڑ کر نمودار ہوتی ہے اور انسانی متخیلہ کی آزادی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ شاعری اپنے اندر ان گنت مماثل اور مخالف نظریات کو سمونے ان کو جگہ دینے اور پھلنے پھولنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

شاعری ایک خود مختار عمل ہے جو متخیلہ پر انحصار رکھتے ہوئے بھی اس انحصار سے ماورا ہے۔ یہ ساتھ چلنے اور نہ چلنے کا اختیار رکھتی ہے۔ یہ وقت اور ماحول کی اپنی تعبیر کرتی ہے اور ان کی گرفت میں نہیں آتی۔ اسے کسی ایک جغرافیے، طبقے یا فکر تک محدود نہیں کیا جاسکتا نہ مصوری کی طرح موجود رنگوں اور فن مجسمہ سازی کی طرح چاک کی ضرورت اسے مادی مواد کی مرہون منت بناتی ہے۔ یہ عمر کے کسی خاص حصے یا کسی مخصوص زبان کی مرہون منت بھی نہیں۔

شاعری کو اس لحاظ سے فلسفے کے متوازی بھی رکھا جاسکتا ہے کہ یہ نہ صرف کائنات، وقت، زندگی، موت اور معاشروں کی معنویت تلاش کرتی ہے بلکہ معنویت بخشتی بھی ہے۔ کیونکہ یہ اپنے اظہار سے بیک وقت جذبے، احساس، کیفیت، ذات، خیال اور تصور کو معنی عطا کرتی ہے اور اسے وسعت دیتی ہے۔ جہاں تک اس کی مقصدیت کا تعلق ہے تو انسانی احساس کو زبان دے کر دوسرے انسانوں کے احساس اور فکر کو متاثر کرنے سے بڑھ کر اور قیمتی مقصدیت کیا ہوسکتی ہے۔

شاعری انسان سے انسان کا خالص احساساتی رشتہ اور رابطہ قائم کرتی ہے۔ محبت، عشق اور غم جیسی مجرد کیفیات کی تشریح کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقی تشکیل اور لسانی تصویر کشی بھی کرتی ہے۔ انسانی جمالیات کی تسکین و تشفی کرنا، جذبات کو آسودگی بخشنا اور انسانی ذہن کی غیر مادی بالیدگی اور نشوونما کر کے معاشرے کے حسن و جمال میں اضافہ کرنا شاعری کے بنیادی اجزائے فیض ہیں۔ نظریاتی اور ترقی پسند شاعری اس سے بھی ایک قدم آگے ہے جس کے ذریعے ایک شاعر اپنی ذات کے دائرے سے نکل کر ایک بڑے انسانی مقصد کے لیے ظالم اور مظلوم، حاکم اور محکوم، آزادی اور مقسوم کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا اور حق کے لیے آواز بلند کرتا ہے۔ وہ جنگوں سے نفرت اور امن سے محبت کا درس دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

# نئے غزل گو - ایک تأثر

ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری کی طرف مائل ہو کر اور عام طبقے کی بات کر کے غزل کے رہن سہن اور کردار و اطوار میں ایک تبدیلی پیدا کر دی تھی جس کے نتیجے میں غزل موضوعاتی وسعت سے ہمکنار ہوئی لیکن پھیلاؤ کے اس عمل میں ابتدائی طور پر وہ مرکزی تہذیبی رو (جسکے نمائندے اقبال ہیں) سے قدرے دور ضرور ہوئی اور اس کی جگہ سماجی عدم تحفظ، محرومی اور مایوسی کی جھلک نمایاں ہوئی جو قیام پاکستان کے ساتھ ہی اُن علاقوں میں جو پاکستان کا حصہ بنے ہجرت کے نتیجے میں ایک نئی طرح کی تنہائی اور مملکتِ خداداد میں بنتے بگڑتے خوابوں کی داستان میں ڈھل گئی۔ نئے رویوں کے متعارف ہونے میں ایسا ہوا ہی کرتا ہے لیکن قیام پاکستان کے بعد شاعری میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جس کے موضوعات اس خطے سے متعلق معاملات کے گرد گھومنے لگے جنھیں پرانے لکھنے والوں کے ادبی معیارات کے تسلسل کے باوجود کسی حد تک پاکستانی ادب کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں نمایاں تبدیلی ساٹھ کی دہائی سے آغاز ہوتی ہے جس میں ایک نظریاتی مملکت کی حدوں میں بعض خارجی محرکات کے سبب ایک غیر نظریاتی نسل پروان چڑھی جس نے بیرونی دباؤ (جس میں مارشل لا بھی شامل ہے) کے تحت فکر و خیال کی رو کو اپنے اندر کی طرف سفر کرنے کے لیے راستہ مہیا کرنے کو ترجیح دی اور نظریہ شکن ماحول میں اظہار کو نئی داخلی راہیں سجھائیں۔ ایک بڑے دائرۂ فکر یعنی کسی نظریہ کی عدم موجودگی میں غزل بھی لسانی تبدیلیوں اور علامتوں کی نئی پوشاکوں سے اپنی سج دھج بڑھانے لگی اور یہی جدیدیت کا تصور ٹھہرا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد وطن، ملت قوم، آزادی، جمہوریت، نئی صبح، انقلاب اور ایسے ہی بہت سے دوسرے موضوعات کا

خاور اعجاز

درآنا اور ہمارے شعرا کا ان سے متاثر ہونا ایک منطقی عمل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر شاعری بیانیہ کے زمرے میں چلی گئی۔ کچھ خواب ٹوٹے اور کچھ نئے خوابوں نے جنم لیا۔ اس شکست وریخت میں پرانی نسلوں نے قدیم مذہبی اور روحانی تصورات میں پناہ لے لی اور نئے ابھرنے والوں نے نئے علوم کے سرمائے سے استفادہ کرتے ہوئے نئی پناہ گاہیں تراشیں لیکن دونوں نے بات اُسی ناقابل تقسیم زندگی کی کی جو قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔ فرق صرف پرایۂ اظہار کا تھا۔

کچھ بعد کے شعرا کے ہاں تنہائی، اذیت، خوف اور کرب کی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو زندگی کے پیچیدہ ہو جانے کا اعلامیہ ہیں۔ ذرا اور آگے چل کر شاعری زندگی کے لاتعداد مسائل سے دوچار ہو جاتی ہے اور غزل بھی محض عشق ومحبت، محبوب کی وفا و جفا، معاملاتِ ہجر و وصال جیسے تصورات سے گزر کر حقیقی زندگی کے ساتھ مربوط ہونے لگتی ہے۔ ہاں محبت کی کسک ضرور باقی ہے جو شاعر کو اپنی ذات اور کائنات کے نئے رشتوں سے آشنا کرا رہی ہے اور شعر کو معنی کی کئی سطحیں عطا کر رہی ہے۔

ماضی یا روایت سے لاتعلقی کے رجحان نے ترقی پسندی کے تحت زور پکڑا تھا جس کے اثرات قیام پاکستان کے وقت نمایاں تھے اور بعض شعرا کے ہاں بعد میں بھی موجود رہے لیکن اس ردِّ قبول کی ایک صورت کو بھی جنم دیا جس کی ماضی قریب میں ایک مثال شہزاد احمد کی دی جا سکتی ہے۔ ان کے بعد نمودار ہونے والوں میں افتخار عارف، خالد احمد، ثروت حسین، جلیل عالی، محمد اظہار الحق، خالد اقبال یاسر اور غلام حسین ساجد وغیرہ ایسے نام ہیں جنھوں نے ستر کی دھائی میں ماضی کی بازیافت اور ایک گمشدہ جہان کو دوبارہ دریافت کرنے کی انفرادی کوششیں کیں اور یوں مل کر وہ ایک ایسے اجتماعی عمل کا حصہ بنے جو ایک مشترک عنصر، یعنی کھوئے ہوئے افق کی تلاش کے گرد گھومتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ لوگ اگرچہ مختلف جزیروں کے باشندے ہیں لیکن اس ایک قدر مشترک کے حوالے سے ان کا رابطہ ایک دوسرے سے قائم ہے۔ تلاش کے اس ربط باہم کے سبب وہ آپس میں ایک وحدت اور باقیوں سے الگ ایک اکائی کی صورت اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جنھوں نے تہذیبی روایت کی پاسداری کے احساس کو از سرِ نو مرتب کرنے میں کردار ادا کیا اور ستر کی دھائی میں ایک بار پھر نظریاتی افقوں کو چھونے کی کوشش کی اور اپنے سے پہلے کی دہائی یا کچھ زیادہ عرصہ تک آوارہ خرامی کرنے والی سوچوں کو ایک سمت دینے کی سعی کی۔ اس نسل کے بنیادی موضوعات انسانی رشتوں کے گرد گھومتے

ہیں خصوصاً متوسط اور زیریں طبقوں کے عوامی موضوعات - ان کے بعض واضح رجحانات میں جدید حقیقت پسندی، نظریاتی حدوں کی از سرِ نو تشکیل، فنی جدتوں کی طرف رغبت، قومی جمہوری جدوجہد میں حصہ اور عوامی امنگوں سے انحراف کرتی ہوئی عسکری آمریت کے خلاف ردِ عمل نمایاں ہیں۔

ذاتی بقا اس نسل کا ایک اہم مسئلہ رہی ہے۔ پاکستانی شعرا کی یہ نسل اپنے ماضی سے جڑی ہوئی ایک مضبوط تہذیبی روایت سے منسلک اور اپنے سے پہلی نسلوں کے اجتماعی تجربات کو فکری نشوونما کے تسلسل کے ساتھ آنے والی نسلوں کے سپرد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے پاس بھرپور کلاسیکی حوالے موجود ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ نئے راستوں کی طرف قدم اٹھانے کی خواہش بھی کمزور نہیں۔ اس نسل نے نئی جہتوں کی تلاش میں پہلے سے موجود فضا کو ایک اور موسم سے آشنا کیا ہے اور شاعری کے مزاج میں خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اپنی درخشاں روایات کو بھی آگے بڑھایا ہے۔

کسی بھی تبدیلی کا جائزہ لینے اور اسے سمجھنے کے لیے وقت کو تین حصوں میں منقسم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یعنی تبدیلی کی ماہیت اس کے حال میں اور اس کا تقابل اس کے ماضی اور مستقبل کے زمانی پہلوؤں سے۔ جو اب قدیم ہو گیا کبھی جدید تھا اور جسے اب جدید کہا جا رہا ہے کل قدیم ہو گا تاہم ہر اگلا زمانہ، زمانہ قبل سے جدید ہی ہوتا ہے لیکن جدید میں قدیم کی کچھ خصوصیات ضرور موجود رہتی ہیں۔ بعض اوقات یہ تسلسل زیادہ اور بعض اوقات کم عرصہ پر محیط ہوتا ہے۔ جہاں یہ تسلسل دیر تک قائم رہے وہاں ارتقا کا عمل سست رہتا ہے اور جہاں یہ جلد معدوم ہو جائے وہاں خوشگوار تبدیلی کی راہ بھی جلد ہموار ہونے لگتی ہے۔ غزل بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ جو غزل اپنے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے وہ اپنے زمانے کی خصوصیات کو نہ سمونے والی غزل کے مقابلے میں کامیاب رہتی ہے - مثلاً بیسویں صدی کے اوائل تک بھی یہ خیال تھا کہ غزل جذبہ ہے اور فکر کا اس سے کوئی تعلق نہیں - پھر اقبال کے زمانہ عروج میں جذبے اور فکر کو ملاتے ہوئے تخیل سے وجود میں آنے والی غزل نے اس خیال کو رد کر دیا۔ آگے چل کر نظریات کی لپیٹ میں آنے والی غزل میں فکر بہت حاوی ہو گئی تاہم اپنے اپنے وقتوں میں یہ تینوں رویے کامیاب رہے کہ یہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتے تھے۔ گزشتہ ربع صدی کی سرحد تک آتے ہوئے اُردو غزل فنی لحاظ سے امیجری کی طرف مائل نئی تراکیب سازی کرتے ہوئے پاکستانی مزاج کی حامل غزل کا رُوپ دھارنے لگی تھی جس پر سے

بوجھل اور دور از کار علامتوں کا سایہ ہٹ چلا تھا اور ابلاغ کی نسبتاً بہتر سطح سامنے آ چلی تھی کہ سیاسی عمل کو کاٹتے ہوئے آمرانہ دور نے غزل کو پھر علامت کی گود میں ڈال دیا البتہ اس عرصہ میں ایک طرف مزاحمتی اور دوسری طرف مابعد الطبیعاتی عناصر کی حامل غزل نے فروغ پایا۔

گزشتہ ربع صدی میں اُردو غزل ایک نئی فضا اور ایک نئے ذائقے سے آشنا ہو چکی ہے جس میں تازہ علامتیں تراشنے اور الفاظ کے نئے تلازمے تلاش کرنے کا عمل نہ صرف تیز تر ہو گیا ہے بلکہ ان میں ایک نئی معنویت جھلک اٹھی ہے جس کا احساس اس سے پیشتر کی غزل میں قدرے مدھم تھا۔ تاہم غزل کی ایمائیت اور رمزیت کو عموماً ملحوظِ خاطر نہیں رکھا جا رہا جس سے اس کی تہہ داری اور پہلو داری مجروح ہو رہی ہے۔ شاید یہ اس لئے ہو رہا ہے کہ اس دور کا شاعر دوسروں پر سبقت لے جانا چاہتا ہے اور اپنے تجربے کو کوئی ٹھوس شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی ترسیل کے مرحلے میں لے آتا ہے جو کہیں کہیں تنگ بندی کا شکار بھی ہو رہا ہے۔ بعض شعرا محض چند غیر مستعمل الفاظ کو غزل میں جگہ دینے کو ہی نئے طرزِ احساس کی ترجمانی سمجھ رہے ہیں اور اپنی سادگی میں غزل کو اکہرے پن سے دوچار کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ خود کو کسی ''اسکول'' سے وابستہ نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ نئی غزل نہ تو بے پر کی اڑانے کا نام ہے اور نہ پرانی منڈیر پر چڑیا بٹھانے کا۔ جب تک شاعر اپنے مزاج کو اپنے عہد کے طرزِ احساس سے ہم آہنگ نہیں کرے گا، نئے رویے اور نئے لہجے کی غزل نہیں کہہ سکے گا اور یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ گذشتہ ربع صدی میں سامنے آنے والوں کی غزل بحیثیت مجموعی ارتقا پذیر ہے جس کی کچھ مثالیں اِن اشعار میں بآسانی مل سکتی ہیں:

مَیں ہُوں اِس شہر میں تاخیر سے آیا ہُوا شخص
مجھ کو اِک اور زمانے میں بڑی دیر لگی
عباس تابش

فصیلِ سنگ کی تعمیر پر جتنا بھی پہرہ ہو
کسی کونے میں کوئی کانچ کی اینٹیں لگا دے گا
رفیق سندیلوی

تم قیامت کا نام دو گے اسے
وقت اپنی تھکن اُتارے گا
اصغر عابد

ہم اپنے عہد کے یوسف ضرور ہیں لیکن
کنویں میں قید ہیں بازار تک نہیں پہنچے
رؤف امیر

ہر دور مرا ساتھ نبھانے کے لیے تھا
لیکن میں کسی اور زمانے کے لیے تھا
غضنفر ہاشمی

قفس سے خود ہی پرندہ رہا کیا مَیں نے
پھر اس کے بعد یہ سوچا کہ کیا کیا مَیں نے
طارق نعیم

اِس اہتمام سے پیکر ترا تراشتا ہُوں
گمان گزرے کہ جیسے بنا بنایا ہے
اختر عثمان

دیر تک کمرے کے اندر قید رہتا ہوں سعید
پھر اچانک ایک کھڑکی کھول دیتا ہے کوئی
سعید احمد

تُو زندگی ہے تو زندہ نہیں تری آنکھیں
تُو روشنی ہے تو میں اختلاف کرتا ہوں
اختر شیخ

یہ کس نشیب میں اُتری ہُوں میں جہاں سے مجھے
وہ آسماں کے برابر دکھائی دیتا ہے
یاسمین گل

اِک ہجوم کو دیکھا اور نوید کو دیکھا
کس جگہ کا منظر تھا اور کہاں لرزتا تھا
افضال نوید

مِرے وجود کے اندر بھڑکنے لگتا ہے
جب اُس چراغ کا انکار کرنے لگتا ہوں
آفتاب حسین

ماہتاب آسمان میں کیوں ہے
یہ حقیقت گمان میں کیوں ہے
افتخار بخاری

تُو ہی تُو ہے مِرے خرابے میں
کاش مَیں بھی کہیں کہیں ہوتا
جاوید انور

یہ کوئی پریم کہانی ہے جسے کہتے ہُوئے
کبھی سپنا، کبھی آنگن، کبھی جیون نہ رہے
سلمان صدیق

تری طرح کے کسی شخص کی تلاش میں ہُوں
خبر نہیں یہ ترا انتظار ہے کہ نہیں
سعود عثمانی

کیسے اُس تک سفر مکمل ہو
ایک لمحہ جو درمیان میں ہے
منصورہ احمد

بساطِ شام و سحر سے گزرتا جاتا ہُوں
ستارے اور شگوفے شمار کرتا ہُوا
خاور احمد

تگ اِک دُوسرے کی وحشت سے
پھیلتا ریگزار بھی میں بھی
عابد سیال

ہم تری چھاؤں میں بیٹھے ہیں تو محسوس نہ کر
دھوپ ایسی ہے کہ تنکا بھی شجر لگتا ہے
افضل گوہر

شام کی پرچھائیں میں چپ سادھ لیتا ہُوں نوید
صبح تک کمرے میں لیکن بولتا رہتا کون
نوید مرزا

کل سامنے منزل تھی پیچھے مری آوازیں
چلتا تو بچھڑ جاتا، رکتا تو سفر جاتا
عزم بہزاد

دیکھا اُسے تو آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
تابش کمال آج یہ اچھا نہیں ہُوا
تابش کمال

سب کی اپنی اپنی حسرت، اپنی اپنی حیرت
ورنہ ایک ہی جیسے ہوتے آئینہ اور پانی
علی ارمان

ہم شاہدہ لطیف زمانے کا عکس ہیں
یہ بات وہ کہے تو بُرا مانتے ہیں ہم
شاہدہ لطیف

آتشِ غم پہ نظر کی ہے کچھ ایسے کہ یہ آنچ
بات کر سکتی ہے اب میرے برابر آ کر
شاہین عباس

بس اتنی سی مری تقدیر بدلی
کبھی زنداں کبھی زنجیر بدلی
جاوید احمد

خواہشوں کے سراب جنگل سے
دل سلامت نکل گیا کیسے
داؤد رضوان

ہماری صبح نہ آئی کہیں بیاباں میں
فضائے دشتِ تمنا میں وقتِ شام ہُوا
صفدر شاہد

انا کی سخت چٹانوں میں راستہ کر کے
کیا ہے ایک خلا ختم دوسرا کر کے
امجد حسین مجاہد

اِک بلندی پہ بھی تُو اتنا لگا ہے نزدیک
ایسا محسوس ہوا قصرِ فلک چھُو آئے
صبا حمید

گزشتہ ربع صدی میں اُبھرنے والے غزل گووں کی غزل میں اُن اپنا تجربہ بول رہا ہے جس میں کہیں کہیں اُن سے پہلی نسلوں کی بازگشت بھی سنائی دے جاتی ہے۔ تاہم اس نسل کا ایک امتیاز جذبہ و احساس کے ساتھ دماغ کا استعمال بھی ہے۔ ممکن ہے اس عمل میں بہت سے اشعار صرف خام مواد کی حد تک رہ گئے ہوں لیکن ان میں ایک نیا پن بہرحال موجود ہے جسے پرانا ذہن شاید اُس طرح قبول نہ کر سکے جیسا موجودہ دور کا اندازِ تفکر رکھنے والا۔ زبان کی حد تک تو بڑی تبدیلی ساٹھ کی دھائی میں واقع ہوئی لیکن اس میں ٹھہراؤ کی کیفیت ستر کی دہائی میں آئی اور گزشتہ ربع صدی میں زبان کی اس تبدیلی نے، جو ساٹھ کی دہائی میں ایک تند لہر کی صورت میں ابھری تھی، ایک نرم رو اور صلح جو موج کی شکل اختیار کی جو دریا کا ساتھ بھی دے رہی ہے اور یہ احساس پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہے کہ اس کا شمار نئے ساحلوں کی نشاندہی کرنے والے رجحانات میں کیا جائے۔ اس رجحان کو رچ بس کر غزل کے نئے مزاج کا حصہ بنتے ہوئے دیکھا تو جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ یہ رجحان غزل کی تہذیبی معنویت میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ کر سکے گا۔ غزل کی پرانی تہذیب کے نمونے تو اب بھی ملتے ہیں لیکن اب یہ کوئی اچھے نمونے نہیں رہے۔ غزل کی پاکستانیت سے اگرچہ ایک نئی تہذیبی کروٹ کا آغاز ہوا ہے لیکن ابھی تجربوں کی تیز آنچ روایت کو کھولائے دے رہی ہے۔ کچھ وقت گزرے

اور یہ تجربے روایت میں گھل مل کر کیمیا ہو سکیں تو شاید غزل کی نئی تہذیب کوئی شکل اختیار کر سکے۔ ابھی تو یہ تشکیل و تعمیر کی کسی درمیانی منزل میں ہے اور اس کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ کرنا بے حد دشوار ہے۔

ترقی پسندوں نے شاعری کو منشور کا پابند بنائے رکھا۔ جدیدیوں نے توڑ پھوڑ بہت کی لیکن نئی زبان کی تخلیق میں مجموعی طور پر اتنی کامیابی نہ ہوئی جتنا شدید اُن کا ردِ عمل تھا۔ انفرادی سطح پر بعض خصوصیات کے نمایاں ہونے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعری نے ان کو قبول بھی کر لیا ہے۔ البتہ ان عوامل کا فائدہ یہ پہنچا کہ ستر کی دھائی میں آ کر شاعری نے ان کی زرخیزیوں کو اپنا لیا اور خشک زمینوں کو چھوڑ دیا۔ ترقی پسند اور جدیدیت کے عناصر سے گھن گرجتا ہوا دریا جب ستر کی دھائی کے میدانوں تک آ پہنچتا ہے تو ایک دھیمے پن سے آشنا ہو کر مترنم ہو جاتا ہے۔ اس کا یہی وصف گزشتہ ربع صدی کی غزل میں بھی ایک اعتماد کے ساتھ رواں دواں نظر آتا ہے۔

اگر اقبال کو سامنے رکھا جائے تو غزل ابھی تک ایک اور عبوری دور سے گزر رہی ہے جیسا کہ غالب کے بعد گزری تھی۔ اقبال نے غزل کی اقدار بدل دی تھیں۔ غزل میں اقبال جیسی تبدیلی تو ابھی تک دیکھنے میں نہیں آئی لیکن نئی اقدار اپنی سیال حالت میں مختلف شعرا کے ہاں مل جاتی ہے۔ شعری اقدار کی یہ سیال حالت گزشتہ ربع صدی کی غزل کو یکسانیت کا شکار ہونے سے محفوظ رکھے ہوئے ہے اور شہرِ غزل نئی سے نئی آواز سے آباد ہو رہا ہے۔ اس عمل میں کچھ آوازیں وقت کے ساتھ اپنی اولین توانائیوں میں کمی کے باعث قدرے مدھم ہو گئی ہیں یا دوسری زیادہ توانا آوازوں کے سامنے ماند پڑ گئی ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ دور نئے لہجے اور نئے اسلوب کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ اگر بات کو پچھلے پچیس برسوں تک ہی محدود رکھا جائے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اُردو غزل کسی وقفے سے دوچار نہیں ہوئی۔ اس کی مقبولیت کا علم ہاتھوں ہاتھ آگے بڑھ رہا ہے اور اس کے معیار اپنے عہد کے تقاضوں کے تحت تبدیل ہو کر بیشتر آگے کی سمت جا رہے ہیں۔ ارتعاش کی یہ مستقل کیفیت اُردو غزل کے ارتقا کی نشاندہی کرتی ہے اور اس کی عظیم روایت کے تسلسل میں ایک اور کڑی کا اضافہ ثابت ہوگی۔ تازگی اور تنوع کی چند مثالیں دیکھیے جو اور کہیں اپنے آپ کو دہراتی ہوئی نظر نہیں آتیں:

دائرے گننا چھوڑ دیئے ہیں چہروں پر حیرانی کے
ان کے پیچھے چھپی ہوئی پرکاریں گنتا رہتا ہوں
اختر شیخ

مدت گذر گئی ہے اِس حال میں کہ میرے
اِک ہاتھ میں دیا ہے اِک ہاتھ ہے دیے پر
احمد حسین مجاہد

مَیں اِس لیے بھی پرندوں سے دُور بھاگتا ہُوں
کہ اِن میں رہ کے مرے پر نکلنے لگتے ہیں
عباس تابش

زیبا نہیں تجھ کو لَو کا لہجہ
تجھ کو تو ابھی ہوا لگی ہے
اختر عثمان

اَب کسی منظر کے باقی ہیں کہاں آثار بھی
خواب سے باہر گری ہے خواب کی دیوار بھی
افضل گوہر

خوشبو کی طرح پھیلی ہے کمرے میں بصارت
شب چھوڑ گیا کون یہ گلدان میں آنکھیں
رفیق سندیلوی

ڈول پانی سے تبھی آئے تو رسی ہی نہ کھینچ
دیکھ! سانسیں زندگی سے بھر کے آنی چاہئیں
رؤف امیر

طبع رنگین سہی اس کی ، مگر ہر لڑکی
پیرہن کی طرح تبدیل نہیں ہو سکتی
یاسمین گل

عجب نہیں کہ کسی روز یاد ہو جائے
زمین پوری مجھے آسمان سارا مجھے
افضال نوید

چلتے چلتے کہیں رُک جاتی یہ دُنیا اِک پل
چاند ہنستا، یہ ہوا ہنستی، یہ صحرا ہنستا
افتخار بخاری

یہ پوسٹر ہیں زخموں پہ پھاہے رکھے ہُوئے
دیوار پر لکھی ہوئی تحریر اور ہے
جاوید انور

کاش تم میری زندگی میں کہیں
کچھ برس پہلے آ گئے ہوتے
کوثر ثمرین

دھوپ سے چھاؤں کسی طور نہ مغلوب ہُوئی
زور سورج نے بہت اپنا شجر پر رکھا
محمد آصف مرزا

اِسی جہاں کے عوض بیچ دی محبت تک
یہی جہاں کہ جو مہنگا تھا مجھ کو دھیلے میں
افتخار مغل

یوں بھی ہوتا ہے کبھی قوس نہیں بن پاتی
زاویہ حلقۂ پرکار میں رہ جاتا ہے
احمد ادریس

زیرِ بحث دور کی غزل میں لفظوں کے حوالے سے مفاہیم کی نئی دنیائیں آباد کرنے کا رویہ ملتا ہے۔ یہ رویہ نظریاتی حدوں کا تحفظ کرتی ہوئی اُردو غزل میں قدرے نمایاں اور کسی واضح نقطۂ نظر کے فقدان یا کسی خاص رجحان سے عاری اُردو غزل میں معدوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اول الذکر غزل بعض اہم اور بنیادی سوال اٹھانے کی طرف مائل ہے جبکہ مؤخر الذکر غزل محض سرسری مسائل حیات کو چھو کر گزر رہی ہے۔ پہلی طرح کی غزل میں رمزیت اور تہ داری ہے جبکہ دوسری قسم کی غزل مذکورہ تخلیقی محاسن سے عاری دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے

ہمیں فنی قرینوں سے جگمگاتی اُردو غزل اُنھی شعرا کے ہاں نظر آتی ہے جنھوں نے اپنی تخلیقی استعداد کو کسی کومٹ منٹ کے ساتھ ایک ندرت اور نئی معنویت سے آراستہ رکھا ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار دیکھیے:

مَیں کسی دِل کے شب و روز سے وابستہ ہُوں
سو نشاں مِلتا نہیں دہر کو اکثر میرا
افضال نوید

لڑے گا کیسے بھلا ایک ہو کے وہ لشکر
جو متفق ہی نہیں کشتیاں جلانے پر
رؤف امیر

اُجڑتی سرزمیں پر پھر کئی منظر اُتر آئے بہاروں کے
کہ دشتِ جاں میں چلنے لگ گئے ہیں قافلے ناقہ سواروں کے
آفتاب حسین

ہماری سمت کی وسعت سے واقف ہے زمانہ
ہمارے دم سے معیار نظر بنتے رہے ہیں
اختر عثمان

ہارا ہُوا شہر بھی ہے غنیمت
جیتے ہوئے دشت بے ثمر ہیں
سلمان صدیق

اِس کی بنیاد میں اِک لفظ محبت رکھ کر
ہم نے اِس شہر کی تعمیر بدل ڈالی ہے
شاہدہ لطیف

گزشتہ ربع صدی کی غزل میں، جس کی کچھ مثالیں آپ نے اوپر ملاحظہ کیں، ایک تخلیقی توانائی اور خود اعتمادی نظر آتی ہے جسے جدید، جدید تر یا اس نوع کی کسی بھی حد بندی میں مقید نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ ساری اصطلاحات اور ان کے متعلقات، زمانہ گزرنے کے ساتھ قدیم تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ غالبؔ اپنے زمانے میں جدید تھے اور اقبال اپنے عہد میں۔ ترقی پسندوں نے جب ایک نیا نظامِ فکر اپنانے کی کوشش کی تو کم سے کم غالبؔ کا زمانہ ضرور پسِ پشت چلا گیا۔ اسی طرح قیامِ پاکستان کے بعد ترقی پسندی کا زور کم ہوتا گیا اور ایک حسی پیرایۂ اظہار جگہ پانے لگا جس نے بالآخر پچاس کی دھائی کے آخر میں ''جدید غزل'' کا عنوان اختیار کیا۔ غزل میں ''جدید'' کی اصطلاح تو شاید کئی مواقع پر استعمال ہو سکے لیکن پچاس کی دھائی میں جدید غزل سے مراد غزل کے موضوعات، مواد اور زبان و بیان میں ہمہ پہلو ہونے کے لیے جا سکتے ہیں۔ شکیب جلالی کو اپنی جدید استعاراتی فضا کے حوالے سے ''جدید تر غزل'' کا پیش رو قرار دیا گیا ہے۔ اب اگر اس سے اگلے زمانے کی غزل کو جدید ترین کہہ لیں گے تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ اسی لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ غزل کو قدیم، جدید اور جدید تر ایسی ترکیبوں میں بند کرنے کے بجائے اُن شعرا کی نشاندہی کی جائے جو غزل کو کوئی انوکھا موڑ، کوئی نیا لہجہ یا کوئی نیا انداز دینے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور میرا خیال ہے گزشتہ ربع صدی میں نمایاں ہونے والے شعرا کی اُردو غزل میں ان کی جھلک موجود ہے۔

☆☆☆☆☆☆

# لنگر، بھنڈارے [یادداشتیں]

برصغیر پاک و ہند کے سب سے اہم بزرگ، ولیوں کے ولی، صوفیوں کے صوفی، درویشوں کے درویش، پیر و مرشد، کاملوں کے رہنما حضرت علیؒ ہجویری المعروف داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دیئے مجھے ایک عمر بیت چکی ہے۔ شادی سے پہلے میں اپنی والدہ کے ساتھ اکثر و بیشتر جایا کرتی تھی۔ بیٹیوں میں سب سے چھوٹی بیٹی ہونے کے باوصف کچھ خصوصی مراعات مرے حصے میں آتی رہیں۔ امی کی سہیلیوں کے گھروں کی سیر ہو، اپنی نانی جن کو سب بے جی کے نام سے پکارتے تھے، ان کی حویلی میں چھٹیاں گزارنے کے لئے جانا ہو یا پھر انا کلی بازار بذریعہ بس یا رکشہ شاپنگ کو جانا ہو، گویا کسی بھی سیر کی خبر کانوں میں پڑتے ہی میں خود کو ان کے ساتھ نتھی کر لینے کے حربے آزمانے لگتی تھی یوں تو بسا اوقات امی کی نوازشیں خود سے بھی مجھ پر نچھاور ہوتی رہتیں۔ اور میں تمام عمر ان کی دم بنی رہی۔ امی ایک سیدھی سادھی مذہبی خاتون ہیں۔ جن سے میں نے جو سیکھا اس کا ذکر شائد مختصر ہو لیکن ان سے میں نے زندگی بھر جو پایا اس کا تذکرہ کسی کتاب سے کم میں نہیں سمائے گا۔ اس عشق کی داستان کے لیے ایک الگ ضخیم باب سپرد قلم کرنا ہوگا۔ یوں تو وہ ہمیشہ ہی اللہ اور اس کے رسولؐ کے ذکر سے لبریز رہیں، میں نے اس سے پہلے کی تاریخ تک، کہ جب دو برس پہلے ایک ہلکے سے سٹروک کے بعد وہ ذہنی صحت برقرار نہ رکھ پائیں ہیں اور نماز روزہ تو کیا اب وہ کھانا پینا بھی بھول گئی ہیں لیکن اس سے پہلے ان کی تمام مصروفیات خدا کی ذات کے گرد رہیں۔ ہر شخص کی طرح ظاہر ہے مری اولین تربیت اور ذات کی تعمیر و تشکیل امی اور ابو کی آغوش سے آغاز پائی۔ لیکن کچھ اور عوامل بھی قدم قدم مری ہستی کے لئے راستے متعین کرتے چلے گئے۔ جیون کے مختلف مراحل پر مشاہدے کی آنکھ سے حاصل کردہ مرے ذاتی تجربات، کتابی مطالعاتی علم، نیز درس گاہوں سے کشید شدہ علوم زیست بسر کرنے کے آداب دھیرے دھیرے مجھ میں منتقل

رخشندہ نوید

ہوتے چلے گئے، خاندانی روایات اور مرے بزرگوں کے عقیدوں نے مری ذات میں نئے دروازے - ان خنک ہواوں میں مست میں لہراتی رہی- لیکن ان سب کے ساتھ مجھے اپنے دل کی آواز پر کان دھرنے کے اعتماد نے بھی ایک خاص خودسری عطا کی ہے- مرے اپنے ایمان کو راسخ بنانے میں رہنمائی کی ہے- اپنی ذات سے وابستہ راہیں متعین کرنے کے لئے میرے اندر سے ایک آواز کا آنا لازم رہا ہے، نفی یا اثبات دونوں صورتوں میں ایک گھنٹی کا بجنا ضروری قرار پایا- جہاں جہاں مجھے اپنا ذاتی خیال اپنے لیے بہتر محسوس ہوا- میں نے لکیر کا فقیر بننے کے بجائے اپنے اندرون کے فیصلوں سے استفادہ کیا- میرے اہل خانہ، اولیا اور صوفیا کے مزارات پر آج بھی مذہبی عقیدت کے باعث نذر و نیاز میں حصہ ڈالنے جاتے ہیں- میری ان پاک بزرگ ہستیوں اللہ کی نیک اور پہنچی ہوئی ہستیوں سے عقیدت فقط مزار کا پھیرا ڈالنے کی حد تک محدود نہیں ہوئی- اُن مشہور و معروف مذہبی و تاریخی اہمیت کی حامل ہستیوں کی خلق خدا سے محبت اور رفاح عامہ کے لئے سادگی اختیار کرنا، زمین نشینی، کھدر پوشی، مادیت پرستی سے مفر اور راہ حق پر چلنے کو دھیان میں رکھنا اول ترین مجھے راہ دکھاتا رہا، اندر بیٹھے بغض اور حسد سے کیسے خود کو بچایا جاسکتا ہے - انتہائی غصے میں کس طور صبر کا مظاہرہ اہم قرار پاتا ہے — اس سے ملتی جلتی بیشتر تراکیب میں نے اولیاء و انبیاء کی زندگی کو پڑھ کر حاصل کیں- وہ کون سے عوامل ہیں جو ذات میں ایک ابدی سکون اور حرارت کو زندہ رکھتے ہیں- اور جن نکات پر زیست بسر کرنے کے باعث کی یہ بزرگ ہستیاں صدیوں سے زندہ و جاوید ہیں- میں حضرت علیؒ ہجویری کی ذات کو جس حیرت اور تردد سے جان پائی- اس میں کووڈ کے دنوں میں مرے گھر میں موجود پنجابی زبان میں لکھی کشف المحجوب ہے- جسے میں خشوع و خضوع سے پڑھا- اپنی بڑی آپی جان کی زبانی بچپن میں ہی میں داتا صاحب داتا صاحب کا ذکر ایسے سنا کرتی جیسے کہ وہ ہمارے گھر کا فرد ہوں-

لاہور شہر کی پہچان میں داتا صاحب کا مزار ایک خاص اہمیت کا حامل ہے جہاں میں امی کے ساتھ بیسیوں بار گئی تھی- جہاں زنانہ اور مردانہ زیارتوں کے الگ حصے تھے - انڈیا یاترا میں ایک مزار پر ہم نے دیکھا کہ خواتین کو حاضری کی اجازت ہی نہیں تھی- میں اور نوید افضل اچھے وقتوں میں ایک بار انڈیا کی دشت نوردی پر اکٹھے نکلے تھے اور امرتسر میں واقع اپنے پرکھوں کی جائے پیدائش، (وکیلوں والی گلی) نہ صرف تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ویزہ نہ ہونے کے باوجود آگرہ میں محبت کی نشانی دیکھنے کا شرف بھی حاصل کر آئے تھے - ویزہ ہمارے پاس صرف دہلی تک تھا لیکن آگرہ کا ویزہ ہم نے دو دن کی محنت کے بعد انڈین ہوم منسٹری سیکرٹیریٹ سے ضد باندھ کر لے ہی لیا تھا- انڈیا کی اسی یاترہ کے دوران حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار میں خواتین کے داخلے پر

پابندی ہمارے لئے حیرت کا باعث تھی۔ معلوم نہیں ہمسایہ ملک میں باقی مزارات پر بھی یہ پابندی لاگو ہے کہ نہیں کیونکہ بختیار کاکی کا مزار تو ہمارے راستے میں آ گیا تھا۔ جبکہ کسی اور مزار پر ہم گئے نہیں تھے۔

حضرت داتا صاحب کے مزار کو جاتے ہم سمن آباد میں اپنے گھر کے باہر سے بس لیتے۔ ہمارا گھر دو سٹاپوں کے بیچ تھا اور بس کے اگر ہم گھر کے باہر کھڑے ہو جاتے کیونکہ ہمارا گھر مین روڈ پر تھا، ڈرائیور ہاتھ دینے پر گھر کے سامنے سے بھی بٹھا لیا کرتے تھے۔ چوبرجی کو کراس کرتے ہوتے بس مختلف سٹاپ پر رکتے رکتے سیدھا چلتی جاتی، قبرستان میانی صاحب کو بائیں جانب مڑتے راستے کو دیکھ کر میں تب بھی آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ امی فوراً فاتحہ پڑھا کرتیں، یہی سیدھی سڑک جس پر خان بابا کا ہوٹل تھا آج کا خان بابا ہوٹل بہت بڑا ریستوران بن چکا ہے۔ آغاز میں یہ فقط ایک مزے دار کھانے کا ڈھابہ تھا۔ بس آگے بڑھتی جاتی پہلے تو ریواز گارڈن کا سٹاپ آتا اس کے بعد کرشن نگر کا، دائیں جانب جان میکڈونلڈ سکول اور اس سے بھی پہلے میکلگن کو کراس ہوئی بس سیکریٹریٹ سے گزرتی۔ دائیں جانب پنجاب یونیورسٹی اور اس کی بیک سائیڈ پر انارکلی بازار، ہم چونکہ انارکلی کا سفر اسی بس پر کرتے تھے اس لئے مجھے راستے یاد تھے۔ سیکریٹریٹ کے بعد ضلع کچہری کا رش اور کالے کوٹوں میں ملبوس وکلا برادری سے میں ہمیشہ مانوس رہی ابو نے اپنے سب بیٹوں کو لاء پڑھایا اور پریکٹس کرائی۔ جو بعد میں اعلیٰ جوڈیشل سیکٹر کے سرکاری عہدوں پر بھی فائز ہوئے۔ انہیں راستوں میں دائیں جانب گورنمنٹ کالج کی پر شکوہ عمارت تھی جس میں بعد ازاں میرا بھائی اور مرے چاچا کے تمام بیٹے داخل ہوئے۔ ان بیٹوں میں سب سے بڑا نوید افضل ہے۔ کربلا گامے شاہ کی اہمیت مجھ پر بعد ازاں کھلی لیکن ہمارے گھر سے دو چار گھر آگے ہمارے ہمسائے میں نقوی برادرز تھے ان کے گھر میں ذوالجناح کا طنطنہ اور سفید براق سے گھوڑے کے اتنے ناز نخرے دیکھ کر میں پریشان ہوا کرتی تھی۔ بہت دھیمے مزاج کی اس فیملی میں ان نقوی صاحبان کے دو تین افراد گھر میں گاہے گاہے قتل کر دیئے گئے تھے۔ کربلا گامے شاہ کے موڑ مڑتے ہی بھائی کی طرف حضرت داتا صاحب کے مزار کا رش اور زائرین کے ہجوم کے قافلے نظر آنے لگتے تھے۔ اکثر ہم اسی موڑ پر بس سے اتر جاتے اور باقی فاصلہ پیدل طے کرتے۔ راستے میں بانس یعنی کین کے فرنیچر کی مارکیٹ پڑتی۔ ایک دو بار میں نے ضد کر کے چھوٹی سی باسکٹ خریدنے پر امی کو مجبور کیا۔ داتا صاحب کے عرس کے دنوں میں تو اس سڑک پر چلنا محال ہوتا کیونکہ پورے پاکستان بلکہ بیرون ملک سے بھی آئے عقیدت مند حاضری دینے آتے تھے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے۔ دور دور سے آنے والے اکثر زائرین مزار کے احاطے میں ننگے پاؤں داخل ہوتے سب سے زیادہ جو بات میرے لئے اہم ہوا کرتی وہ دور دراز سے، یا قرب و جوار سے آئے چادریں

چڑھانے والا وہ قافلہ ہوتا جو چادر کے چار پلو تھام کر سڑک پر چلتے اور ایک ڈھول والا ہمراہ ہوتا۔ اس کی تھاپ پر کئی لوگ دھمال بھی کرنے لگتے اور اس چادر پر پیسوں کی بارش بھی ہوا کرتی۔ یہ چادریں نہ صرف بھاٹی گیٹ کے ارد گرد ہی نہیں بلکہ ہمارے گھر سمن آباد جو کہ ایک مین روڈ پر تھا، وہاں سے بھی دن میں کئی کئی بار ڈھول کی آواز سن کر میں ٹیرس پر دھمال دیکھنے ضرور جایا کرتی تھی۔ عرس کے دنوں میں مزار تک جاتے راستوں میں دوطرفہ دکانوں پر بکنے والے پھولوں کی خوشبو، مزار پر چڑھائی جانے والی سبز چادریں اور مزار کے لئے بنائے گئے غلاف جن کے کنارے پر لگے گوٹے کناری سے ان کی قیمت کا تعین ہوتا تھا۔ اسی احاطے میں کھانے پینے کی بیشتر اشیا کے کھوکھے بھی موجود تھے۔ عرس کے دنوں میں مزار کے اردگرد احاطے میں ذائقہ دار کھانوں میں بہت اضافے ہوا کرتے تھے۔ قتلمے، کچی، میٹھے پکوڑے، پٹھورے چنے، اندرسے، جیسے طعام آخری بار میں نے شائد اسی زمانے میں کھائے ہونگے۔ حضرت داتا گنج بخش کے مزار کے باہر لنگر کی جا بجا دکانیں موجود تھیں۔ وہی لنگر یہاں سے زائرین خرید کر مزار کے احاطے میں عبادتوں اور نوافل میں مشغول زیارتیوں میں تقسیم کیا جاتا۔ اس بھنڈارہ کے بانٹنے کے عمل میں کھینچا تانی، چھینا جھپٹی بھی ہوتی۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ کوئی بھی لنگر یا بھنڈارہ خواہ وہ بھری بھرائی دیگ کیوں نہ ہو اس کو ختم ہونے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ لنگر کے ساتھ ساتھ ان دکانوں میں تسبیحیں، سپارے، پلسورے، سرمے، مٹھائیوں اور دیگر اشیاء کی دکانیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ میں اپنی والدہ کی اوڑھنی جو ایک بڑی کشادہ چادر ہوا کرتی، اس سے متاثر ضرور تھی لیکن ان کے ساتھ ساتھ میں ننگے سر ہی چلا کرتی تھی۔ مزار کے گیٹ کے قریب بہت سے مجاور سبز چوغے میں ملبوس گلے میں لمبی لمبی بڑے بڑے موتیوں کی کالی اور گہرے رنگوں کی مالائیں، ہاتھوں میں کڑے پہن کر اللہ والے بننے کے بھیس میں موجود ہوتے تھے۔ بچے اٹھا کر لے جانے کا ڈر مجھ میں انہیں دنوں بیدار ہوا تھا جو ساری عمر میرے ساتھ رہا۔ کیونکہ امی مجھے سمجھاتی تھیں میرا ہاتھ مت چھوڑنا۔ کوئی پکڑ کے لے جائے گا۔

گیٹ سے باہر بھی دیگوں کے بانٹے جانے کا سلسلہ جاری ہوتا تھا، جو اندر بھی بدرجہ اتم میٹھے زردے اور چنے والے چاولوں کی دیگوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اکثر خواتین جلیبیوں کے لفافے یا کچھ اور مہنگی، بڑھیا کھانے کی اشیا زائرین میں بانٹنے کو تقریباً مزار پر حاضری کی شرط تصور کرتی تھیں۔ باہر کی دکانوں پر ملنے والے لنگر میں وہ تبرک مجھے ابھی بھی یاد ہیں، جو شاید اب ناپید ہو چکے ہوں۔ ایک بتاشے، سفید چینی کے بنے اُجلے، بڑے بڑے سکوں کی طرح کے یہ گول بتاشے نہایت مزے کے ہوتے تھے مگر ان کے کھانے سے ہاتھ چپکنے لگتے تھے اس کے علاوہ تبرک میں مکھانے، چنے اور پھلیاں بھی شامل ہوا کرتی تھیں۔

مجھے معلوم ہے کہ ہر شخص اس جہان میں خوشی

اور غم دونوں دولتوں کو اپنے اپنے حالات سے کشید کرتا ہے۔ غم کی حالت میں کسی مزار پر جا کر اللہ سے دعا کرنا شاید زیادہ معتبر تصور کیا جاتا ہے کیونکہ وہاں دعا کا بابرکت ماحول بنا ہوتا ہے۔ وہاں بھی میں نے لوگوں کو میں رو رو کر، ہاتھ اٹھا کر، اپنے دل کی مرادوں اور اپنے مصائب کی مشکل کشائی کے لیے اونچی اونچی آواز میں فریاد کرتے سنا تھا۔

پھولوں کی لڑیاں اور پھولوں کی پتیاں مزار کے اندر نچھاور کرنے والے کس خشوع خضوع سے ان پھولوں کے ساتھ اپنے دل کی عرضی ڈالتے تھے۔ وہ قابل دید اور قابل داد تھا۔ میں ہمیشہ سے کسی کو روتا نہیں دیکھ سکتی، لازماً مری پلکیں نم ہوتی ہیں۔ اُن فریادیوں کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں میں تب بھی بھگو لیا کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو بھی درد اور دکھ لاحق ہے اس کی مسیحائی جلد سے جلد فرما۔ مزار کے احاطے میں پھرتی مجاور خواتین جو اپنے طور پر مزار کی حفاظتی بھی بنی ہوا کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کسی کی جھولی میں از خود پھول آ گرے تو جان لو، مراد پوری ہوگئی۔

ایک مرتبہ ایک پھول کہیں سے اڑ کر مرے فراک کی جیب میں بھی آ گیا تھا۔ میں پھولوں کی اس زمانے میں بھی شیدائی تھی لیکن ان پھولوں کی خوشبو اور طرح کی تھی۔ اور تب مری خواہشات میں بس امی کے ساتھ جگہ جگہ گھومنا ہی تھا۔

ان تمام بچپن کی یادوں میں، جس میں مجھے عبادت میں مصروف ان اکثر خواتین کے چہرے یاد ہیں جو سینکڑوں نفل ادا کیا کرتیں۔ قرآن کی باآواز بلند تلاوت میں مشغول ہوتیں۔ مجھے وہ پلیٹوں کا گلہ بھی یاد ہے، لوہے کا بھاری سبز رنگ کا چھوٹا سا بکسہ۔ جو ہر دم بھرا رہتا تھا۔ آج بھی ذہن پر نقش ہے کس طرح ہر کوئی اپنی حیثیت اور جذبے کے مطابق اس گلے میں سکے روپے، ڈالر اور پاونڈ ڈالتا تھا۔ ہمارے ساتھ کے گھر میں رہنے والی رضو خالہ جو امریکہ اپنے بیٹوں کے پاس آتی جاتی رہتی تھیں امریکہ میں بیٹھے بیٹھے گھر پیغام بھیجتی تھیں کہ مرا ماہانہ صدقہ دس ڈالر حضرت داتا صاحب کے گلے میں ڈال کر آؤ۔ اس رقم کو اصل میں تو مزار کے اسی احاطے کی مرمت اور صفائی پر خرچ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا بہت زیادہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پاؤں کے نیچے فرش پر بکھری پتیاں اور کھانے کی میٹھی چیزیں چپکا کرتیں اور مکھیوں کے ایسے میلے ہوتے تھے کہ کچھ کھانا دوبھر ہو جاتا تھا، لیکن اب میں نے سنا ہے کہ سرکاری سطح پر اس متبرک عمارت کی تزئین و آرائش اور زائرین کی سہولیات کا بہتر انتظام ہو چکا ہے۔ نئی مساجد کی تعمیر کروائی گئی ہے اور اب ان عظیم الشان ہستی کا مزار پہلے جیسا نہیں ہے۔

مری یادوں میں سب سے مضبوط یاد وہ جوتوں کے ڈھیر ہیں جو زائرین مزار کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد، مزار کے صحن میں داخل ہونے سے پہلے، اتارتے ہوئے اندر داخل ہوتے تھے، جوتیوں کا رکھوالا بعد ازاں

ان کو کسی جوتوں کی الماری کے خانوں میں ٹھونس بھی رہا ہوتا تھا لیکن وہ ہزاروں کی تعداد میں اتارے ہوئے جوتے مرے ذہن میں نقش ہیں، بیشتر گرد آلود، سستے، ربر کے جوتے، جو کہ آنے والوں کے اس سفر کو عیاں کرتے تھے، جو انھوں نے یہاں تک آنے میں طے کیا ہوتا تھا۔ دوسرے ملکوں شہروں سے آئے عقیدت مند آج بھی اسی طرح جوش جذبے، عقیدت، محبت، استدعا، اور دعا سے مغلوب ہو کر حضرت داتا گنج بخش کے دربار حاضری دیتے ہیں۔ اور یونہی دیتے رہیں گے۔ ایک منظر مری زندگی میں اور بھی ایسا ہے کہ جہاں آنے والوں کی اتاری ہوئی جوتیوں کا ڈھیر ایسا ہی تھا کہ وہ بھی مرے ذہن سے نکل نہیں پاتا۔

اس کمرے میں جہاں وہ زخمی پڑا تھا۔ اس میں داخل ہونے والے اشخاص بھی جوتیاں اتار کر اندر جا رہے تھے۔ میں پردے کی اوٹ سے دیکھ رہی تھی۔ لان کی جانب سے کھلنے والے راستے پر موجود بیٹھک میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ایک آتا اور ایک جاتا کے مصداق لوگ قطاروں میں کھڑے ہوئے تھے کہ اگلے نکلیں تو دوسرے داخل ہوں۔ یہ کمرہ زنان خانے سے صاف دکھائی دیتا تھا۔ یہ ایک گیسٹ روم تھا۔۔ اگر میں ہلکی سی بلائینڈ کو کھول کر دیکھنا چاہتی تھی تو منظر مجھ پر منکشف ہوتا چلا جاتا تھا۔ تین دن میں ان کے گھر رہی۔ اور ان تین دنوں میں سینکڑوں اشخاص اس زخمی کی مزاج پرسی کو آئے۔ اس کی مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کی جوتیوں کا ڈھیر مجھے عقیدت سے لبالب دکھائی دیا۔ مزاج پرسی کو آنے والوں میں کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ ان ہاتھوں میں یا تو پھولوں کے بقچے، گلدستے، ہار تھے، یا پھر مٹھائی، پھل، بسکٹوں کے ٹوکرے اور ڈبے تھے۔ جب میں روزانہ جب ان کے کچن میں جاتی تو کیا دیکھتی ہوں کہ تمام شیلفیں ان مٹھائیوں اور کھانے پینے کی اشیاء سے بھر چکی ہیں۔ اب ملازمین نے کچن کے فرش پر پلاسٹک بچھا کر مٹھائیوں اور پھولوں کو رکھنا آغاز کر دیا ہے۔ کچن اس وقت کچن نہیں بلکہ کوئی دکان معلوم ہو رہا تھا۔

شام کو جب میں اس کے مہمانوں سے اس کی فراغت ہونے پر اس کے کمرے میں جاتی، جو شاید رات بارہ بجے کے بعد ممکن ہوتا کیونکہ آنے جانے والوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا اور جوتیوں کا ہر دم جمع ایک ڈھیر تھا۔ یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا۔ میں کمرے میں داخل ہوتی تو اس کمرے میں بھی پھولوں کے گلدستوں سے میزیں طاق شیلف بھرے ہوتے، کمرے سے ایسی مہک باہر تک آیا کرتی گویا عطر کی ہزار بوتل چھڑک دی گئی ہو۔

ان آنے والوں میں خاص و عام دونوں طرح کے اشخاص اور عقیدت مند تھے۔ جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ افسران، ایم این اے، ایم پی اے، آرمی جرنیل، ڈی سی او، ڈی پی او نیز پولیس کے تمام افسران اس زخمی کی خبر گیری کے لیے بھلے پانچ منٹ کے لیے آئے لیکن اسے شاباش ضرور دی۔ اور اس کے کارنامے کو سراہا۔

اس کے ساتھ ساتھ اسے ملنے والوں کا وہ طبقہ جو اُس کے زیادہ قریب تھا اس کے رشتہ دار اور دوست بھی تھے وہ ایبٹ آباد میں پوسٹڈ تھا ایبٹ آباد جہاں وہ زخموں سے چور ہسپتال سے فارغ ہو کر اپنے گھر کی بیٹھک میں اس وقت پڑا تھا ایبٹ آباد کا ایک ایک ڈرائیور، سپاہی، صوبے دار، غرض علاقے کے تمام وہ لوگ جن پر اُس نے ہمیشہ نظر کرم کی اور جن کی ہر مشکل میں وہ کام آنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ سبھی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوئے۔

اس سید زادے نے پاک پتن کے علاقے سے تعلق رکھتا ہے، ایبٹ اباد کے قریب 7 ڈاکوؤں کو جو ایک بینک لوٹ کر فرار ہو رہے تھے۔ اُن سے تن تنہا مقابلہ کیا اور ڈاکوؤں کو ان کے منطقی انجام تک پہنچایا۔ اس بہادری میں اس کی ٹانگ پر جوابی فائرنگ کے باعث گولی لگی۔ اور وہ بری طرح زخمی ہوا۔

اس کا زخمی ہونا ایک روح فرسا خبر تھی۔

سید صاحب صرف ایک اعلیٰ پولیس افسر ہی نہیں ہیں اس کے ساتھ ساتھ ایک ایماندار اور مخلص افسر بھی ہیں۔ میں جتنا ان کو جان پائی اور ان کی شریک سفر سے جس قدر سنا اور دیکھا، میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ غریب پرور اپنے گھر کے ملازمین کے لیے گھر کی مخالفت کے باوجود اپنے باورچی خانہ میں لنگر کا انتظام ختم نہیں ہونے دیتا۔ اور وہ اتنی خاموشی سے اردگرد پھیلے مستحق افراد کی امداد کرتا ہے کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہ لگے۔ اُس کی شجاعت پر اعلیٰ عہدیداروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ دور و نزدیک کے شہروں اور دیہاتوں سے اُس کے واقف، اس کے دوست، اُس کو داد دینے اور اس کی صحت و سلامتی کی دعا کرنے آئے تھے۔ ان تین دنوں میں مجھ پر زندگی کے بہت سے راز کھلے۔

پولیس افسران کا خاکہ جو ہمیشہ سے مرے ذہن میں بھی باقی سب لوگوں کی طرح بن چکا ہے، کیونکہ سننے اور دیکھنے میں یہی آتا ہے۔ لیکن سید حسنین حیدر کا ہمارے خاندان کے افراد میں شامل ہونا اور پھر اپنے سنجیدہ رویئے سے ہمارے گمان میں تبدیلی پیدا کرنا ہماری خوش قسمتی ہے۔ اُسے 2022 میں اُس کی اس بہادری پر صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

مجھے وہ قیامت آثار لمحہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ جب میری بیٹی کا روتے بلبلاتے ہوئے فون آیا تھا! امی جی حیدر (اس کے شوہر) کو ڈاکوؤں سے مقابلے میں گولی لگ گئی ہے۔

اس جہان فانی میں ہمیں کس طرز احساس کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے۔ یہ ہر شخص کا ذاتی فیصلہ ہے۔ آیا ہم موجودہ دور کی کمرشل دوڑ، نفسا نفسی کے عالم، دولت کے حصول میں کوشاں رہیں یا اپنے بہتر رویئے، اپنے اعلیٰ اخلاق اور خلقت کا بھلا سوچ کر زیست گزاریں۔ میں نے اپنے اندر بہت سی مثبت تبدیلیاں اپنے بچوں کو دیکھ کر خود میں پیدا کی ہیں۔ مجھے مری بیٹی نے پچھلے برس کہا تھا کہ ہم سب مل کر کسی دن داتا گنج بخش کے دربار پر حاضری دینے جائیں گے۔ مجھے اپنے دل کی گھنٹی کا انتظار ہے!

☆☆☆☆☆

# حامد یزدانی کے خالی بالٹی اور دوسرے افسانے

حامد یزدانی سے میری محبت گزشتہ چالیس سال پر محیط ہے، جواب 2022 میں اس کے افسانوں کی کتاب ''خالی بالٹی اور دوسرے افسانے'' کی اشاعت کے بعد عقیدت میں تبدیل ہوگئی ہے۔

دراصل شاعری کو کہانی اور افسانے سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ غزل کا ہر ہر شعر اور نظم تو پوری کی پوری ایک کہانی ہے۔ حامد یزدانی اور کہانی لازم وملزوم ہیں۔

شاعری کے کردار عموماً محبوب، معاشرہ اور سب سے زیادہ واحد متکلم شاعر کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ کہانی کے کرداروں اور شاعری کے کرداروں میں سب سے اہم فرق یہ ہوتا ہے کہ شاعری کے کردار مکان کے اندر بیٹھ کر تخلیق ہوتے ہیں، اور کہانی کے کردار مکان کے باہر جا کر تخلیق ہوتے ہیں۔

حامد یزدانی نے جو ہجرت کی ہے، وہ اس کی کہانی میں بہت نمایاں ہے۔ حامد یزدانی ایک بہت بڑے اور عظیم شاعر (یزدانی جالندھری صاحب) کا بیٹا ہے۔ مگر اس نے اپنا الگ مقام بہت محنت سے بنایا ہے۔ حامد یزدانی کے افسانے اس کی شاعری کے خمیر سے طلوع ہوتے ہیں۔ اس نے ہماری دھرتی کے ''نان اور کلچے'' کو ہجرت کے پیوند سے ''پیزہ'' (Pizza) میں تبدیل کر دیا ہے۔

ذوالفقار فرخ

حامد یزدانی کے افسانوں کے بارے میں بہت سے باتیں ہوسکتی ہیں۔ معاشرتی، نفسیاتی، سوشیوا کنامیکل، سب باتیں کی جاسکتی ہیں مگر میرے نزدیک حامد یزدانی کے افسانوں کا اصل جوہر "مشاہدہ" ہے۔

حامد کے مشاہدے اور جذب کرنے کی صلاحیت کو اگر میں کوئی نام دوں تو پنجابی میں "بال ہڈاں دی اگ" اور فارسی میں "بہ نوکِ خارمی رقصم" ہوگا۔

شاہ حسین سے مولانا روم کی مثنوی معنوی کا سفر حامد نے اپنی ہجرت کے دوران کیا۔ حامد یزدانی کا ہر کردار اس کا اپنا عکس اور پرتو ہے۔ "خالی بالٹی" کے پس منظر میں سیرِ افلاک بھی ہے۔ "خالی بالٹی" ابنِ عربی کی "فتوحات مکیہ" پڑھے بغیر لکھنا ممکن نہ تھا، اور ظاہر ہے "فتوحاتِ مکیہ" سے پہلے حامد نے "فصوص الحکم" لازمی پڑھی ہوگی۔

یہ وہ نکات اور پس منظر ہے جو ہم عام طور پر فراموش کر دیتے ہیں۔ آپ اس کا افسانہ "دھمال" پڑھ لیں تو یہ سب نظر آ جائے گا۔ "خاکی تھیلا" ہو یا "خالی بالٹی"، "دھند" ہو یا "کہانی" آپ پڑھتے جائیں، فسوں اور طلسم آپ پر طاری ہوتا جائے گا۔ آپ کو ایسا لگے گا کہ یہ آپ نے پہلے بھی پڑھا ہے، مگر کہاں، یاد نہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

.................................

ان تمام افسانوں کے لیے کہ 'یہ دل کو چھو لیتے ہیں'، 'الگ لب و لہجہ رکھتے ہیں'، 'افسانوی ادب میں ایک نیا اضافہ ہیں'، اور 'قیمتی سرمایہ ہیں'...... ایسے کلیشے جملے لکھنا بہت آسان ہے۔

مگر [ایک بہت بڑا 'مگر'] ان افسانوں کی تفہیم ایک بالکل عام قاری، جس کی شخصیت کی بنیادوں میں شاعری کی کوئی اینٹ نہیں، اس کی تفہیم اور اظہاریہ بالکل مختلف ہوگا، اور ایک وہ شخص جو مقتولِ شاعری ہے اور شعر کا وزن اٹھا سکتا ہے، اس کے لیے یہ افسانے بالکل تازہ ہوا کا جھونکا ہوں گے۔ سکھ کا سانس لے گا وہ ان افسانوں کو پڑھ کر۔ بات بہت لمبی ہوسکتی ہے۔ مختصر وقت اور مختصر صفحات میں حامد یزدانی کے شعر اور اس کی نثر کا تجزیہ ممکن نہیں۔ ایک سے زیادہ نشستوں میں یہ بات ہوسکتی ہے۔ آخری جملہ یہ کہ حامد یزدانی کے سمندر کو مختلف رکابیوں میں تقسیم کر کے اپنے پاس "خالی بالٹی" کے علاوہ کچھ نہیں رکھا۔

☆☆☆☆☆

# راغب تحسین منفرد طرز و اسلوب کا حساس شاعر

جب انسان نے فہم و شعور کی منازل طے کیں، اس نے اظہار رائے کے مختلف ذرائع استعمال کیے پھر سب سے خوبصورت اور موثر ذریعہ شاعری قرار پایا۔ تاریخِ انسانی میں شعرائے کرام کو ہمیشہ عزت و تکریم حاصل رہی۔ ہر دور میں شعرائے کرام اعلیٰ ترین اور منتخب افراد تصور کیے جاتے رہے۔ مختلف ادوار میں شاعری انسانی داخلی اور خارجی اظہار کا خوبصورت ذریعہ بنی رہی۔ کبھی انقلابات کا راستہ دکھاتی رہی اور کبھی انفرادی و اجتماعی کرب و تکلیف کے اظہار کا ذریعہ بنی، کبھی معاشرے، سماج اور تہذیب و تمدن کو آشکار کروانے اور تاریخ کو مرتب کرنے کی ذمہ دار بھی بنی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور بادشاہوں کے مزاجِ برہم اور فشارِ خون کو اعتدال پر لانے کا ذریعہ بھی تھی۔ غرضیکہ انسان کے ہر درجے اور مرتبے پر یہ انسانیت اور معاشروں کی نباض رہی ہے۔ درباروں میں شاعروں کو بہت عزت و تکریم حاصل ہوتی تھی اور اُن کا درجہ وزیر اور مشیر کے برابر خیال کیا جاتا تھا۔

ایک خالص شاعر ہر دور کی سچی تاریخ مرتب کر رہا ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے اشعار میں اپنے معاشرے کو دکھا رہا ہوتا ہے اپنے دکھ سکھ کو بیان کر رہا ہوتا ہے۔ عدل و انصاف یا جبر و ظلم دونوں کی تصاویر دکھاتا ہے کیونکہ وہ سماج کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اگر کسی نے عہد کے صحیح احوال جاننے ہوں تو وہ اس دور کے شاعروں کو پڑھے تو سارا معاملہ اس پر آشکار ہو جائے گا۔ بالکل اسی طرح راغب تحسین ایک سچا اور سُچا شاعر ہے یہ اپنے معاشرے اور اردگرد کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہے باخبر ہے اور معاشرے میں پائی جانے والی ناہمواریوں پر نوحہ کناں بھی رہتا ہے اس لیے مورخ کیسی بھی تاریخ لکھ ڈالے جب وہ راغب تحسین اور اس کے قبیل کے دوسرے شعرا کی شاعری پڑھے گا تو پورا عہد اس پر کھل جائے گا۔ اتنی لمبی تمہید کا مقصد بھی یہی تھا کہ راغب تحسین کی

فیصل زمان چشتی

شاعری کوئی عام شاعری نہیں بلکہ یہ انسانی تاریخ کی ایسی دستاویز ہے جس میں اس عہد کی جھلک اپنی پوری سچائی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ راغب تحسین جس عہد میں زندہ ہے اس میں معاشرتی زبوں حالی اپنے عروج پر ہے ظلم اور جبر اپنی پوری درندگی اور سفاکی کے ساتھ معاشرے کے مفلوک الحال طبقے کو اپنے نوکیلے پنجوں اور خونخوار جبڑوں میں جکڑے ہوئے ہے۔ امیر، امیر ترین اور غریب غریب ترین ہوتا جارہا ہے افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم ہے۔ سماجی رویے اور اقدار بُری طرح پامال کی جارہی ہیں پورا معاشرے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس جیسا حال ہے۔ حکمران طبقے بپھرے ہوئے سانڈھ کی طرح عوام کے حقوق کی پامالی کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ یعنی راغب تحسین کا دور دورِ ابتلا ہے اور یہ احساس، ملوک اور دردمند دل رکھتے ہیں اس لیے انھوں نے انسانی حقوق کی پامالی، منفی رویوں، بے اعتدالیوں اور سماج میں پائی جانے والی بے انصافیوں کو اپنی شاعری کے موضوعات کے لیے چنا ہے اور ایسے ایسے اشعار کہے ہیں جو صرف یہی کہہ سکتے ہیں:

ذہنی پستی کا استعارا ہے
شہر یہ کیا ہے بس گزارا ہے
زندگی درد کا سمندر ہے
موت اس کا حسیں کنارا ہے
جس صدی سے گزر رہے ہیں ہم
زندگی کا نیا شمارا ہے

..............................

راغب تحسین نے انسانیت کے درد کو محسوس کیا اور زندگی کے تلخ حقائق کو نوکِ قلم کے ذریعے قرطاس پر انتہائی سلیقے سے سجا کر ہمارے سامنے رکھا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک تلخی ہے ایک کرب ہے، چبھتی ہوئی سچائی ہے، حقائق ہیں اور ایک ایسا آئینہ ہے جس میں معاشرے کا ایسا چہرہ نظر آتا ہے، جس کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہے۔ انھوں نے معاشرتی دکھ اور کرب کو اپنی روح میں کشید کیا ہے اور ماورائی تخیلات سے ایسے فن پارے تخلیق کیے ہیں جو ہماری حسیات پر اپنی پوری قوت کے ساتھ اثرانداز ہوتے ہیں۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

جعلی سورماؤں پر قہقہہ تو بنتا ہے
راہبر کی چالوں پر قہقہہ تو بنتا ہے
صرف ان کے شر سے ہے بھوک ننگ دنیا میں
جنگ کے اداروں پر قہقہہ تو بنتا ہے
کس سلیقہ مندی سے شہر کر دیا برباد
سازشی اداروں پر قہقہہ تو بنتا ہے
سہل گوئی کے عادی فکر شعر سے عاری
خود فریب ادیبوں پر قہقہہ تو بنتا ہے

..............................

ظلم اور جبر کے خلاف آواز اُٹھانا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اس کے لیے بڑا دل چاہیے شعور و فہم کی پاکیزگی درکار ہوتی ہے۔ اور انسان کو خود سچا بن کر دکھانا پڑتا ہے اپنا

کردار شو کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام نبیوں کی سنت رہا ہے اور ولیوں کا شیوہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق بہت پیاری ہے اور جو اس کی مخلوق کا سہارا بنتا ہے دادرسی کرتا ہے وہ اس کو محبوب بنالیتا ہے اور اگر غور کیا جائے تو تمام عبادات کی روح بھی خدمتِ خلق خدا اور معاشرتی مساوات و میل جول میں پنہاں ہے۔ راغب تحسین معاشرے میں موجود منافقت، چرب زبانی، دروغ گوئی اور حکومتوں کی مکاری و عیاری پر انتہائی نالاں نظر آتے ہیں اور ان کی ریشہ دوانیوں سے پیدا ہونے والے حالات پر نوحہ کناں دکھائی دیتے ہیں کیونکہ یہ حساس طبیعت کے مالک ہیں اور لوگوں کو دکھ درد اور تکلیف میں دیکھ کر پریشان اور اُداس ہو جاتے ہیں اور اُس کیفیت میں ایسے ایسے اشعار کہہ جاتے ہیں جو عوام الناس کے دلوں کی دھڑکن بن جاتے ہیں:

کشکول کی نسبت سے ہو مشہور دفع دور
اور اس پہ نظر آتے ہو مغرور دفع دور
جنگل میں درندے بھی ہیں اک نظم کے پابند
اور یہ ہے ترے شہر کے دستور دفع دور
تم سانپ کی مانند خزانوں پہ ہو قابض
پھر لوٹ کے ہو جاؤ گے مفرور دفع دور
دھرتی کے نگہبان اِسے نوچ رہے ہیں
یہ جاں کے لیے بن گئے ناسور دفع دور

.....

راغب تحسین اس فرسودہ نظام اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں پر کڑھتے رہتے ہیں اور کیونکہ یہ دلیر اور بہادر بھی ہیں اس لیے اس کے خلاف آواز بھی اُٹھاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے علم و فن اور ہنرمندی کو عوام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ان میں بے پناہ تخلیقی جواہر اور صلاحیتیں موجود ہیں یہ چاہتے تو لب و رخسار اور ہجر و وصال کی شاعری کر کے مشاعرہ لوٹ شاعر بن سکتے تھے۔ یہ تعلقات بناتے مراعات حاصل کرتے لیکن یہ دلیر اور غیرت مند شخصیت کے حامل ہیں اس لیے انھوں نے کٹھن اور طویل راستے کا انتخاب کیا اور یہی بڑے لوگوں کی نشانی ہوتی ہے کہ وہ اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے جینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

راغب تحسین انسان کے کردار کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع بناتے ہیں۔ اس کے اعمال اور کارکردگی پر کڑی نظر رکھتے ہیں اس کی مکاری اور عیاری پر غمزدہ اور افسردہ نظر آتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے تو اپنے افعال و کردار سے نائب خدا بن کر دکھائے اس میں خدا کی روح پھونکی ہوئی ہے یہ فرشتوں سے افضل ہے یہ پوری کائنات اس کی سہولت کے لیے بنائی گئی ہے اور اسے عقل کی دولت سے مالا مال کیا گیا ہے تو یہ اپنی توانائیاں مثبت کاموں پر لگائے دنیا کو جنت نظیر بنائے نہ کہ اس کو دوزخ بنانے کے اسباب پیدا کرے۔ قوانینِ قدرت کا پابند رہے آپس میں معاملات درست رکھے۔ طاقت کا ناجائز استعمال نہ کرے محبتوں کو پروان چڑھائے اور کدورتوں کو پھیلنے سے روکے۔ ظلم

کو روکے اور انصاف کا بول بالا کرے۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے اکثر اوقات ان کا رویہ جارحانہ بھی ہو جاتا ہے اور وہ معاشرے کے ناسوروں کے خلاف سرجن کی طرح نشتر چلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ذرا دیکھیے:

شر سے آراستہ تطہیر کی ایسی تیسی
یعنی شیطان صفت پیر کی ایسی تیسی
ایک تو عدل کا ہونا ہے نہ ہونے جیسا
دوسرے عدل میں تاخیر کی ایسی تیسی
جن کو لڑنا تھا، ہوئے زر کی محبت کے اسیر
یعنی شمشیر مع تیر کی ایسی تیسی
تو فقط حُور کے اعضائے نہاں ناپ سکا
میرے واعظ تری تنویر کی ایسی تیسی
ہر نشانہ ترے اپنوں کے بدن چھیدتا ہے
اے کماں دار ترے تیر کی ایسی تیسی

.....

تین اشعار اور ایسے ہی ردھم اور کیفیت میں دیکھیے:

عشق کے حال پہ تھو حسن کے کردار پہ تھو
یار شطرنج نظر آئے تو اس یار پہ تھو
جس کے پگڑ سے چمکتے ہوں شہنشاہ کے بوٹ
ایسی دربار سے بخشی ہوئی دستار پہ تھو
جو فقط اپنے ہی لوگوں کا گلہ کاٹتی ہو
ایسی تلوار مع صاحبِ تلوار پہ تھو

.....

راغب تحسین شعر میں حسن و جان ڈالنا بہت اچھی طرح جانتے ہیں یہ شہ کی دہائی کے شاعر ہیں یہ بخوبی جانتے ہیں کہ شعر میں شعریت اور معنویت کیسے پیدا کرنی ہے شعر کی بُنت پر ان کو ملکہ حاصل ہے یہ جب الفاظ اور خیال کو شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں تو اس کے معانی پوری شان و شوکت اور وقار کے ساتھ قاری کے شعور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

انھوں نے جن زمینوں اور بحور میں شاعری کی ان کو اَمر کر دیا۔ یہ فنی مہارت سے مسلح اور خیال و فکر سے لبریز شخصیت کے حامل شاعر ہیں اس کی مثال میں کچھ اشعار سے دوں گا کہ اس زمین اور قافیہ ردیف میں بیسیوں شعرائے کرام نے طبع آزمائی کی۔ لیکن جو خیال و رعنائی، مصرعوں کی بنت، تلازمہ کاری اور استعارات و تشبیہات کی خوبصورتی ان کے ہاں پائی جاتی ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی (اشعار دیکھیے):

اک تماشا ہے تری خُلد سے آیا ہوا شخص
ہو گیا تجھ سے خفا تیرا بنایا ہوا شخص
میری بستی کا محافظ بھی شکاری نکلا
دے رہا ہے یہ خبر، جال میں آیا ہوا شخص
حدِ پاتال سے بھی نیچے چلا جاتا ہے
خانۂ چشم کی کھڑکی سے گرایا ہوا شخص
ہم سے ملنا ہو تو اوقات میں رہ کر ملنا
ہم جھٹک دیتے ہیں سینے سے لگایا ہوا شخص

.....

آج کل اگر آپ غزل کو طاقتور اور منفرد رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی ردیف نئی ہو گی تو پھر ہی شعر نکل سکتا ہے کیونکہ غزل میں شعر ردیف کی طاقت سے اوپر آتا ہے سخت ردیفوں میں بڑا شعر کہنا مشکل کام ہوتا ہے اور اس بات کا راغب تحسین صاحب کو پورا پورا ادراک ہے

اس لیے اگر ہم بغور دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی غزلوں کے ردائف انتہائی مختلف اور منفرد ہیں جیسا کہ دفع دور، فائدہ، جہاز، ایسی تیسی اور مجھو وغیرہ شامل ہیں یہ تو میں نے مثال کے لیے بتایا ہے۔ ان کی پوری شاعری میں ایسی ردائف ہی استعمال ہوئی ہیں۔ ان کی شاعری میں اتنی وسعت اور گہرائی ہے کہ ان پر لکھتے چلے جائیں مگر اس کے اوصاف ختم نہیں ہوں گے کیونکہ مضامین کا انبوہ ان کے ہاں پایا جاتا ہے جو ان کی شاعرانہ عظمت کا گواہ ہے۔ میری ان تمام باتوں سے آپ یہ نہ اخذ کرلیں کہ راغب تحسین بہت خشک شاعر ہیں اور محبت کی شاعری سے بالکل دور اور کنارہ کش ہیں۔ ایک محبت کرنے والا شخص ہی معاشرے کی بے چینی اور بے انصافی کو محسوس کرتا ہے۔ ہر انسان کی طرح ان کے دل میں بھی ایک محبت کرنے والا دل موجود ہے۔ اور یہ اپنے کومل اور لطیف جذبات کا اظہار بھی کرتے ہیں اور محبت کی شاعری کے کمالات بھی دکھاتے رہتے ہیں کچھ اشعار دیکھئے:

تمہارے بالائی ہونٹ پر جو حسین تل ہے وہ میرا دل ہے
تمہاری چوں کی ارت میں جو دھڑکتا ہے دل ہے وہ میرا دل ہے
وہ عہد ناموں پہ عشق ناموں پہ سانحہ موں پہ، کہیں بھی
چھپا ہوا تیر نیم کش والا جو بھی دل ہے وہ میرا دل ہے
ملاپ ہے مرگِ عشق بے شک، جدائی ہے اک تسلسل عشق
سو دونوں کے درمیان جو آج تک تل ہے وہ میرا دل ہے

.................................................

آخر میں راغب تحسین صاحب کے لیے دعائیں اور نیک تمنائیں کہ یہ اسی طرح شعر و ادب کی بلندیوں کو سَر کرتے ہیں ہمارے ذوقِ شعر کا سامان کرتے رہیں اور اپنے بے پناہ تخلیقی وفور اور جواہر سے تخلیق خدا کی آواز بننے کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں کیونکہ ان کی آواز قوم کی آواز ہے، اس دھرتی کی آواز ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ حق کے لیے اُٹھنے والی ایک آواز اُن لاکھوں لوگوں سے بہتر ہے جو ظلم تو سہتے ہیں بغاوت نہیں کرتے آخر میں ان کی ایک نظم سنانا چاہتا ہوں کیونکہ یہ تخلیقی شخصیت ہیں اور نظم میں بھی ان کی آواز اُتنی ہی توانا ہے:

وحشتِ محبت میں ایک دعا
تمہاری آنکھوں کے گرد پھیلی ہوئی سیاہی
جو اُن عذابوں کا آئینہ ہے
جو تم نے جھیلے
کئی برس سے۔ مری محبت بنی ہوئی ہے
میں کب بھی خود کو اپنے کمرے میں بند کر کے
تمہاری آنکھوں کو سوچتا ہوں
تو اپنے سینے میں اک الاؤ جلا کے
واحد گواہ یعنی خدا سے (جو میری اس محبت کا
رازداں ہے)
دعا یہ کرتا ہوں دست بستہ
کہ اس الاؤ کی روشنی میں
وہ دوے اثر جو
تمہاری آنکھوں کے گرد پھیلی ہوئی سیاہی کو
جذب کر لے

☆☆☆☆☆

# "ٹھکراو اب کہ پیار کرو میں نشے میں ہوں"
## غزلِ ریختہ اور شاہد کبیر

یکم مئی 1932 کو ناگپور انڈیا میں پیدا ہونے والے اپنے عہد کی غزل کے بہترین شاعر جناب شاہد کبیر صاحب کو دنیا سے پردہ کیے تقریباً ۲۲ برس بیت چکے- ان کا مجموعہ کلام ''پہچان'' دبئی سے ہوتا ہوا مرے ہاتھوں میں پہنچا-

یہ غالباً ان کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو1999 میں مومن پورہ ناگپور سے شائع ہوا- اس سے پہلے شاہد کبیر نے اپنی شعری پہچان1952 کے بعد بنانی شروع کر دی تھی- کتاب مٹی کا مکان'' کے عنوان سے غزلوں کا مجموعہ 1979 میں اس سے پہلے شائع ہو چکا- ان کی بہت ساری غزلیں اور شاعری ہندوستان اور پاکستان کے مشہور گلوکار گا چکے ہیں - جن میں لتا منگیشکر، جگجیت سنگھ، چترا سنگھ، ہری ہرن، چندن داس، منی بیگم، سلمان علوی اور صابری برادران سرِ فہرست ہیں-

مجھے نہیں معلوم کہ ان کی کتاب کا دیباچہ لکھنے والے پروفیسر سید یونس سے ان کا تعلق کیا اور کس حد تک ہے مگر ایک جملہ کہ ''وہ بیچارہ شاعر کیا کرے کہ جس کے اعصاب پر ابتدائی شاعری کے دور سے ہی مرزا غالب سوار ہو چکے ہوں'' نے مجھے چونکا دیا- میں نے دوبارہ سے کتاب کو دیکھنا شروع کیا تو اُن سے اختلاف کیے بنا نہ رہ سکا کہ ایک شاعر پر غالب کا ٹھپہ لگا دینا ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے- وہ شاعر جس نے نہ صرف اپنی شاعری میں کلاسیکیت کو مجروع نہ ہونے دیا بلکہ دورِ جدید کی شاعری کو بھی کسی نہ کسی طرح سے اپنے ہنر سے جدت دی اور جدید شاعری کا کھلے بازووں سے استقبال کیا- ایسے شاعر کے کام کو کلاسیکیت تک محدود کر دینے سے ظرف چھوٹا پڑ جاتا ہے-

معروف استاد شاعر اور نقاد ڈاکٹر یونس خیال کے مطابق کسی بھی شاعر کی شاعری کو پرکھنا ہو تو اس کی غزل کے مطلعوں سے دیکھو اور اگر شاعر کے بارے جاننا ہے تو اس کے مقطعوں کو دیکھ لیجے- زیر مطالعہ



عاطف جاوید عاطف

کتاب ''پہچان'' اپنے آغاز سے ہی قاری کو چونکا دیتی ہے۔

کسی امیر کو کوئی فقیر کیا دے گا
غزل کی صنف کو شاہد کبیر کیا دے گا

..........

دیکھنے کو تو یہ شعر کسی غزل کا مقطع محسوس ہوتا ہے مگر شاہد کبیر غزل کا آغاز اس شعر سے کر کے قاری کو چونکا دیتے ہیں:

ایک اور مطلع سے غزل کی اُٹھان دیکھیے:

بے سبب بات بڑھانے کی ضرورت کیا ہے
ہم خفا کب تھے منانے کی ضرورت کیا ہے

----------

ایسے نزاکت بھرے نفیس اشعار پر جگجیت جیسا ہنر پسند گائک کیوں نہ مرمٹتا۔

شاہد کبیر کی شاعری اور تصوف:

محاکمات الشعراء' میں محسن نے لکھا ہے کہ ''کسی ہندوستانی کی طرف سے حزیں کا دل نہ دکھائے جانے کے باوجود انھوں نے 'تذکرۃ الاحوال' میں بادشاہ سے لیکر گدائے بے نوا تک کے خلاف زہر اُگلا اور اِس خیال کی اشاعت کی کہ ہندوستان فضل وکمال کے لیے زمین شور کا حکم رکھتا ہے۔انھوں نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ انھیں تمام دارالخلافت میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جو رتبۂ فضیلت رکھتا ہو۔'' (بحوالہ اردو ادب کی تاریخ از تبسم کاشمیری۔ص ۲۹۲-۹۷)

سراج الدین علی خانِ آرزو جو اپنے وقت کے بڑے عالم، استاد اور بڑے شاعر تھے، انھوں نے ''تذکرۃ الاحوال'' کا حرفاً حرفاً عالمانہ جواب ''تنبیہ الغافلین'' (۱۷۴۱-۴۴) لکھ کر دیا اور حزیں کی خودسری اور غرور کو توڑنے کے لیے اُس میں پوشیدہ خامیوں اور غلطیوں کی طرف واضح اشارے کیے۔ آرزو کی اس کوشش نے انھیں ہندوستانی شعرا کے درمیان ہیرو بنا دیا۔اس تاریخی معرکہ آرائی کے بعد ہندوستانی شعرا کو یہ احساس ہو گیا کہ فارسی میں خواہ وہ کتنی بھی دسترس حاصل کر لیں، ایرانی النسل فارسی شعرا انھیں زبان داں تسلیم نہیں کریں گے۔ لہٰذا آرزو نے جو انھیں فارسی کی جگہ ریختہ (اردو) میں شاعری کرنے کی رغبت دلائی تھی، اُس نے اُس دور کے نوجوان شعرا کو اس طرف مائل کر لیا اور یہی دلّی دبستانِ شاعری کا نقطۂ آغاز تھا۔ اُس دور کے نوجوان شعرا جن میں بیش تر آرزو کے شاگرد تھے، انھوں نے ریختہ میں شاعری کرنا شروع کر دی۔ان شعرا کے ہاں شاعری میں تصوف کا رنگ نمایاں تھا۔''

شاہد کبیر کے ہاں حمد اور نعت کے علاوہ بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں۔ جو ان کی روحانی نسبت کی طرف توجہ دلاتے ہیں: جیسے

کیے ہیں اتنے جہاں اور اک کرم کر دے
مرے خدا تو مری خواہشوں کو کم کر دے

اوپر اُدھر ہوا کے اشاروں پہ ہے پتنگ
اور اس طرف کماں کے ہاتھوں میں ڈور ہے

انجانے میں بھاگ رہے ہیں لوگ اپنی پرچھائیں سے
اک اک کے قدموں کو پکڑ کر پوچھ رہے ہیں سائے کون

شاہد کبیر بطور جدت پسند شاعر:

دلّی دبستان اور لکھنؤ کے شعرا میں بیسویں صدی کے

چند گنے چنے ہی ایسے شعرا تھے جنھوں نے اپنی شاعری میں کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ جدیدیت کو بھی مجروح نہ ہونے دیا اور نئے امکانات کے لیے رستخیز کا دروازہ کھلا رکھا۔ شاہد کبیر کا شمار بھی ان چند شعرا میں سے ہوتا ہے۔ ذرا شعر ملاحظہ ہو:

غزل میں کوئی نئی بات بھی تو ہو شاہد
ادب میں آپ کی شہرت تو اچھی خاصی ہے

ایک اور شعر دیکھیے:

اس سانولے سے جسم کو دیکھا ہی تھا کہ بس
گھلنے لگے زباں پہ مزے چاکلیٹ کے

.....

چاکلیٹ جیسے لفظ کو شاعری میں اس نزاکت اور خوبصورتی سے برتنا اور ایسا برتنا کے قاری کو چاکلیٹ کا ذائقہ لفظوں میں گھل کر روح اندر تک محسوس ہو جائے یہ شاہد کبیر کا ہی خاصہ ہے۔

جمالیات کا شاعر شاہد کبیر:

کسی بھی شاعر کی شاعری میں موسم اور حسنِ قدرت کا در آنا معمولی بات ہے۔ لیکن یہ بات خاص تب ہو جاتی ہے کہ وہ ان اثرات کی شدت کو اپنے لفظوں میں ڈھالنے کا ہنر کس طرح آزماتا ہے۔ فراق، میر تقی میر اور ولی دکنی کی طرح ان کی بے شمار غزلیات میں جمالیات کے رنگ نمایاں ہیں جس کو وہ محبت کے رنگ میں گوندھ کر خود سے مکالمہ کرواتے ہیں تو شاعری سے خوشبو آنے لگتی ہے۔ کچھ اشعار دیکھیے:

آتی ہے دبی چاپ سی تم ہو کہ صبا ہے
آنگن میں کوئی پھول چٹکتا ہے کہ تم ہو

زرد ملبوس میں آتی ہیں بہاریں شاہد
اور تو رنگ خزاؤں کا بھی دھانی مانگے

روز آپس میں اُلجھ جاتے تھے دھاگوں کی طرح
کتنے دلچسپ مراسم تھے تمہارے میرے

پھول گلدان میں کانٹے ہیں مرے ہاتھوں میں
میں نے چاہا تھا کہ ہر چیز نھکانے سے رہے

اور پھر میری پسندیدہ غزل کا یہ مطلع دیکھیے:

غم کا خزانہ تیرا بھی ہے میرا بھی
یہ نذرانہ تیرا بھی ہے میرا بھی

.....

جگجیت اور لتا جی کی آواز میں ریکارڈ کی گئی اس مدھر غزل میں لفظ کسی جھرنے کی طرح دل پہ گرتے ہیں اور سنتے سنتے یہ جھرنا روح کی وادی میں دریا بن اتر جاتا ہے:

اسی طرح ایک اور غزل جسے جگجیت نے ایسی خوبصورتی سے گایا کہ من کے شاعری اور سُر دونوں کا نشہ ہو جاتا ہے:

ٹھکراو اب کہ پیار کرو میں نشے میں ہوں
جو چاہو میرے یار کرو میں نشے میں ہوں

.....

کہیں کہیں شاہد کبیر اپنی دھرتی اور اپنی مٹی سے بھی جڑے نظر آتے ہیں:

تباہ کر گئی کچے مکان کی خواہش
میں اپنے گاؤں کے کچے مکان سے بھی گیا

اور آخر میں یہ شعر:

شاہد صدا لگانے سے پہلے یہ سوچ لو
صدیوں کے بعد بھی تمہیں دہرائے گی صدا

رستخیز کی دنیا میں شاہد کبیر کی غزل صدا لافانی ہے اور یقیناً بار بار دہرائے جانے کے قابل ہے۔

☆☆☆☆☆

# ہجر کو بخشی دھڑکن ___ ایک جائزہ

شاعری کے لیے کوئی مخصوص کرافٹ متعین کیا جاسکتا ہے؟ یہ بحث شاعروں کے مابین تو ہو سکتی ہے مگر شاعر، قاری کے مابین ہرگز نہیں، قاری تو محض یہ چاہتا ہے کہ شاعری ایسی ہو، جس میں برتے گئے مضامین اور اپنی پوری قوتِ شعری کے ساتھ ایسے بیانیے میں آئیں کہ روح میں اتر جائیں اور زندگی کے آئینہ دار ہوں۔ ''ہجر کو بخشی دھڑکن'' غالباً فیصل زمان چشتی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جس سے یہ بات بہرحال ثابت ہوتی ہے کہ وہ محض کسی باطنی دباؤ کے تحت ہی شاعری نہیں کرتے بلکہ اپنی معاصر معروضی صورت حال سے جذب کئے ہوئے تجربات کو بھی اپنی تخلیق کا حصہ بناتے ہیں، کوئی جذبہ ان کے ہاں ایسا ضرور ہے جو مسلسل اظہار چاہتا ہے۔

وہ معلوم کائنات میں سے ایسے مضامین کی تلاش میں رہتے ہیں کہ تخلیق کا سفر اپنے پورے واقعاتی امکانات کے ساتھ آگے کی طرف جاری رہے، زیرِ نظر مجموعہ میں ''ہجر اور دھڑکن'' کے باہمی ربط کو انھوں نے موضوعِ تخلیق بنایا ہے، ہمارے روائتی شاعروں نے ہجر کی جس معنویت سے صفحات کالے کیے وہ گھٹن ہے، اذیت ہے، دُکھ ہے، اکلاپہ ہے، لیکن فیصل زمان چشتی کے ہاں ہجر اپنی نئی معنوی سطحوں اور تہ داری کے ساتھ برتا گیا ہے، اُس کا ہجر لطف و سرشاری کی کیفیت اور رواں زندگی کا پیامبر ہے، جو زندگی کے مختلف پڑاو کے ساتھ ساتھ اپنے ذائقے بھی بدلتا ہے اور رنگ بھی۔ اشعار دیکھیے:

دُکھ تہِ تیغ کیا ہجر کو بخشی دھڑکن
اپنی جاگیر میں ہم نے بڑی سرداری کی

تمہاری یاد نے زخموں کو زندگی بخشی
تمہارے ہجر کی آتش سے غم پگھلنے لگے

زندگانی جہاں لاچار ہے، نادار بھی ہے
تم کو معلوم کہاں ہجر کی جُزیات کا دُکھ

.....

اسی طرح زندگی کے دیگر رموز و عوامل کا اظہار بھی ان کے شعروں میں مکمل شعوری پختگی کے ساتھ ملتا ہے، جہاں تصوف بھی ہے، فقہی حوالے بھی، پچھڑے ہوئے طبقات کے مسائل اور نوید صبحِ نو کے روشن امکانات بھی اپنے پورے تلمیح و استعاراتی نظام کے ساتھ ملتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

زندگی جینے کا تاوان لیا کرتی ہے
بوجھ ایسے ہیں کہ ہم جاں سے گزر جاتے ہیں

**مقصود خالق**

کتنے صحرا تھے جو بوندوں کو ترستے ہی رہے
تم نہ سمجھو گے سُلگتی ہوئی برسات کا دُکھ

.....

سماجی مذہبی منافرت کو کیسا تلمیحاتی تاثر عطا کیا ہے جس کی جھلک آج بھی کہیں دکھائی دیتی ہے۔ شعر دیکھئے:

نفرت قیام میں ہے تو سازش ہے سجدہ ریز
لگتا ہے شہر مسجدِ ضرار بن گیا

.....

میرے نزدیک کسی بھی تخلیق کار کے شعری رجحانات وميلانات اور اسکے استعاراتی نظام پر تبصرہ وتاثرات دینے کے لیے فنکار یا تخلیق کار کو بھی سمجھنا از حد ضروری ہے، پڑھنے والا جب تک اپنے ذہن کو تخلیق کار کے انفرادی احساسات وتصورات سے ہم آہنگ نہیں کر لیتا، وہ تخلیق کار کے کلام کی حقیقت وماہیت کے متعلق قطعی فیصلہ نہیں دے سکتا اور نہ ہی اس قسم کا کوئی فیصلہ دینے کا اسے حق حاصل ہے۔ اب تنقیدی ونظری معیارات ہوائی نہیں رہے بلکہ یہ مؤثر علم اب گنے چُنے موضوعات کی چار دیواری کو توڑ کر تخلیق اور اُس کے فنی لوازمات کے علاوہ شاعر اور اس کے مزاج کی کائنات پنہائی کا بھی احاطہ کرنے لگا ہے۔

ہنری بولٹ لکھتا ہے:

"ہم تخلیق کار کو عموماً کاریگروں کے زُمرے میں شمار کرتے ہیں، وہ ایک گویا ہے، ایک نگینہ تراش ہے، ہم اس سے بحیثیت آدمی کوئی تعلق نہیں رکھتے، بلکہ ہمارا مطلب اس کے کام اور محض کام سے ہے، وہ بھی اس حد تک کہ یہ کام ہمارے مقصد کو کیسے پورا کرتا ہے، ہم یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اپنی جبلت اور وجدان کا اظہار کیسے کرتا ہے"

تخلیق کار کو سمجھنے کے لیے سب سے اوّل (اور شاید سب سے آخر بھی) اُس کی زندگی کے خاص خاص نشیب وفراز دیکھ لینا ضروری ہیں۔ خارجی ماحول نہایت شدت سے فن کار یا تخلیق کار کی داخلی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے فنی نظریات کی تفصیل میں جانے سے پہلے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی وسیع کائنات کے تاریخی اور عصری شعور کا ادراک کرتا ہے۔ شعور جسے تاریخ اور ماحول سے الگ نہیں کیا جا سکتا، جو تغیر کی بہت سی منزلوں سے گزرتا ہے۔ ہر چیز کی مانند انسانی سماج کے ساتھ ساتھ شعور بھی بدلتا ہے اور جذبات بھی۔ انسانی فطرت ازلی اور ابدی نہیں ہے، اسی طرح شعور اور جذبات بھی ازلی اور ابدی نہیں ہیں۔ تغیر اور تبدیلی ناگزیر ہے۔ شعور کی تبدیلی انسانی فطرت کا تقاضا ہے، یہ تبدیلی ہمارے احساس حُسن اور ذوق جمال پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور جمالیاتی قدریں بدل جاتی ہیں، دراصل احساسِ حُسن اور ذوقِ جمال شعور کی ہی ایک قسم ہے۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے کوئی مخصوص ذوق لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ اِس کے اعصاب میں محسوس کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو خود صدیوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے، یہ صلاحیت ترقی کر کے ذوق اُس وقت بنتی ہے جب وہ تاریخی حالات کے دائرے میں زندگی

اور سماج کے حقائق سے دوچار ہوتی ہے۔
ہم اپنے حواسِ خمسہ کے بغیر حُسن کا احساس نہیں کر سکتے، مختلف قسم کی خوشبوؤں میں فرق کرنا، مختلف آوازوں میں بہت ہی لطیف تمیز کرنا، انسانی انگلیاں جس طرح نرم، سخت اور کھردری سطح کو محسوس کرتی ہیں، آنکھیں جس طرح رنگوں کے باریک سے باریک فرق کو دیکھتی ہیں، یہ انسانی خصوصیات خود مختلف انسانوں میں مختلف ہوتی ہیں، جن کے کان موسیقی سے آشنا نہیں وہ ''بھیروں'' اور ''شامو کلیان'' میں فرق نہیں کر سکتے، جن آنکھوں نے ہزاروں تصویروں کو نہیں دیکھا وہ ''اجنتا'' اور ''چغتائی'' کی تصویروں کے خطوط اور رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتیں، یہ ذوق کی تربیت کا سوال ہے جو ہمیشہ مخصوص تاریخی حالات میں، مخصوص سماجی اثرات اور عناصر کے تحت ہوتی ہے۔
''ہجر کو بخشی دھڑکن'' بھی اِس طرح مخصوص تاریخی اور سماجی اثرات کا شعوری تخلیقی اظہار ہے، جو جدید غزل کے پیرائے میں کیا گیا ہے، اِن کے موضوعات میں جہاں محبت اور ہجر کے لازوال جذبوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے وہاں سماجی، تہذیبی رویّوں کی بدلتی ہوئی نفسیات اور بچھڑی ہوئی اخلاقی صورت حال کے ساتھ ساتھ بین المذاہب یکجہتی کی خواہش بھی ہے:

سوچ پتھریلی ہوئی لہجے میں نرمی نہ رہی
جب سے ہم پکے مکانات میں آ بیٹھے ہیں

اپنے احباب کی فہرست ذرا پھر سے بنا
آزمائے ہوئے لوگوں پہ ہی تکیہ کیوں ہے

رہتے تھے آستین میں، شہ رگ پہ آ گئے
ہم نے بھی سانپ شوق سے پالے کہاں کہاں

سہمے ہوئے بازار ہیں سمٹی ہوئی گلیاں
ہم شہر کی پیشانی پہ ڈر دیکھ رہے ہیں

کچھ اور نہیں یہ تو مکافاتِ عمل ہے
حاکم کو بھی ہم شہر بدر دیکھ رہے ہیں

.....

''ہجر کو بخشی دھڑکن'' کا اسلوب منفرد اور مروجہ روایتی غزل کے سانچے سے ذرا مختلف ہے، اور شاعر نے غزل کے کلاسیک اور جدید رُجحانات کو یکساں برتنے کی خوبصورت کوشش کی ہے، یوں کہہ لیں کہ خیال ذہن کے پیچیدہ راستوں سے گزرتا ہوا جب زبان کے سانچے میں ڈھلتا ہے تب صرف اور صرف اِن کی شخصیت سے میل کھاتا ہوا انتہائی سادہ بیانیے میں ڈھلنے کے ساتھ ساتھ جدت سے بھی مزین ہوتا ہے، جس کی آواز نہ اتنی بلند ہے کہ سماعت پر بار ہو اور نہ ہی اتنی دھیمی کہ ذوقِ سماعت پر گراں گزرے۔ چند اشعار اور دیکھیے:

ملتے رہو کہ راکھ میں حدّت ذرا رہے
ویسے تو کوئی کام ضروری نہیں رہا

ہر بات میں وہ بات ہے جس بات کا ڈر ہے
معصوم سے شاعر کو عنایات کا ڈر ہے

---

شاعر نغمہ گو کی طرح چھوٹے چھوٹے مصرعوں کو اِس طرح باہم پیوست کرتا ہے کہ کہیں بھی کچھ اضافی محسوس نہیں ہوتا، اور لطفِ معنی بھی جنم لیتا ہے۔ اِس کا اپنا ہی مخصوص انداز اِس کی تخلیق کو اور روشن کر دیتا ہے۔ شاعر اپنی جمالیاتی جغرافیائی حدود میں پائی جانے والی بدصورتیوں سے صرفِ نظر کر کے ایک نیا جہانِ حُسن تخلیق کرتا ہے، وہ سماج جہاں طرح طرح کی تنگ نظر اور تعصّبات کی عمل داری ہے، جہاں ضمیر کی آواز گھٹی ہوئی فضائے جاں میں رہتی ہے، جہاں اظہارِ محبت پر قدغن کا سلسلہ دراز ہے، فیصل زمان چشتی کی والہانہ شیفتگی کے اظہار کے لیے یہ سماج یقیناً کسی سطح پر ناسازگار ماحول کا حامل ہے، چنانچہ اس بستی سے دُور اور اس سے جداگانہ بستی کو آباد کرنے کی آرزو، جو پھولوں، محبتوں اور ہجر کی نکہتوں سے معمور ہو ایسی بستی بسانے کے خواہاں ہیں، یوں انکی شاعری میں موضوعیت اور معروضیت کسی تضاد کا پتہ نہیں دیتی بلکہ ذات و حیات کی یکجائی نظر آتی ہے، وہ واقعے، سانحے، حادثے اور احساس کو بیان نہیں کرتے بلکہ انہیں تصویر کرتے ہیں۔ امیجری، تصوریت اور تخیل کی چلتی پھرتی تصویروں کی صورت میں پیکرِ شعر میں ڈھالنے کے ہنر نے ان کی شاعری کو دھنک رنگ بنا دیا ہے۔

ایک باشعور تخلیق کار اپنے تخلیقی اظہار کے لیے گویا کوئی بھی صِنف انتخاب کرے، اُس کے پیچھے مقصد یہی کارفرما ہونا چاہیے کہ اِس سے انسان کی بہتری ہو اور علم کی دنیا میں خوبصورت اضافہ ہو۔

کروچے کہتا ہے،

''جو تخلیق ہم پیش کرتے ہیں، جو مجسمہ ہم تراشتے ہیں اور جو گیت ہم گاتے ہیں، اُسے پہلے اپنے درون میں ہم تخلیق کر چکے ہوتے ہیں، اپنے اندر وہ مجسمہ تراش چکے ہوتے ہیں اور وہ نغمہ اپنے اندر کی دنیا میں ہم گا چکے ہوتے ہیں''

یعنی ادراک (Conceive) کرنے کا پہلا مرحلہ اور معرضِ تحریر اور معرضِ وجود میں لاتے لاتے متعدد مرحلوں سے مذکورہ تخلیق گزر چکی ہوتی ہے، تب کہیں اپنا ایک اُسلوب دریافت کرتی ہے اور تخلیق کار کی تخلیہ میں احساسِ جمال کی تربیت ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ ادراک علم کی دین ہے اور شعور اُس کی شاہراہ، میں شعور کی شاہراہ کے کامیاب شاعر فیصل زمان چشتی کو ''ہجر کو بخشی دھڑکن'' پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، جنہوں نے ہجر بسر کیا اور اس کے نئے معنی ہم تک باہم پہنچائے۔

☆☆☆☆☆

# ''امتیاز نامہ''

''امتیاز نامہ''، جناب امتیاز گلیانوی کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ انداز اس کا کسی قدر سوانح سا ہے۔ جناب امتیاز گلیانوی کی علمی و ادبی حیثیت، ان کا فن اور نظریہ اس میں زیادہ اہم ہے۔ لیکن ان کرداروں کو ہم ان سے الگ نہیں کر سکتے، جو زندگی بھر ان کے ہم سفر رہے ہیں۔

ہجرت تو ویسے بھی سُنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور انھوں نے 3 ہجرتوں کو یک جان کر دیا ہے۔ ہجرت میں پاؤں کے آبلے اور دل کے زخم، انسان کو اندر سے توڑ کے رکھ دیتے ہیں، لیکن جو بھی ہجرت میں ثابت قدم رہا وہی کامیاب ٹھہرا، اور ہمارے نزدیک جناب امتیاز گلیانوی اپنی تینوں ہجرتوں میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کی زندگی کے نشیب و فراز، ان کی زندگی پر براہِ راست اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ پہلی نظر میں جناب امتیاز گلیانوی لاابالی، اپنی دھن کے پکے، دوست نواز، ہمدرد، ملنسار، خلیق، سیاسی اور انقلابی نظر آئیں گے۔ یہ کتاب مسلسل واقعات، حالات اور ان کے عہد کی سچی اور روشن تصاویر پر مبنی ہے۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو، ان کی بے تابی، ان کے عزائم، ان کی زندگی کے نشیب و فراز، ان کی ادبی زندگی کی مسلسل جدوجہد اور ان کی زندگی و شخصیت کا پرتو اس کتاب میں شامل ہیں۔

اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی جگہ پر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی حالاں کہ ایسے کئی مواقع آئے جہاں یہ خود کو پورٹریٹ کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی بات منوانے پر زور نہیں دیا، بس حقیقی تصاویر پیش کر دی ہیں۔ بس اپنی رو میں، اپنی دُھن میں، انھوں نے جو کچھ محسوس کیا وہ لکھ دیا۔ اس طرح ان کی زندگی کے خاصے سنگِ میل ریکارڈ ہو گئے ہیں۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ہاں بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں ہیں اور یہ انھیں خوبی کے ساتھ اُجاگر کرنے پر بھی قادر ہیں۔

''امتیاز نامہ'' ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں جناب امتیاز گلیانوی کی زندگی کی باریکیوں کا بھی علم ہوتا ہے، جو ان کے افسانوں کے

**نعمان منظور**

علاوہ ہیں۔ ان کی زندگی جس طرح گزری اور جس طرح جناب امتیاز گلیانوی نے زندگی کو برتا، ان کے خلوص و محبت، اور ان کا لوگوں کے ساتھ سلوک ایسی چیزیں ہیں، جو ان کی شخصیت کی اہم جزو ہیں۔

''امتیاز نامہ'' ہے تو ان کی ہی زندگی کی کہانی بلکہ زندگی کے رنگ برنگے خاکے ہیں، ان کی اس داستان میں کہیں کہیں روسو کی سی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے کیونکہ ان کے ہاں بھی سچائی ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔

جناب امتیاز گلیانوی نے اس کتاب میں جو ذریعۂ اظہار اختیار کیا ہے وہ ان کی شخصیت کا سارا اندرونی نقشہ پیش کرتا ہے۔ جتنے وہ متاثر ہوئے قاری خود بخود اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے علم حاصل ہی نہیں کیا اسے برتا بھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ علم کے حاصل کرنے کی لگن نے ہی انھیں اخلاقیات اور انسانیت کے قریب کر دیا ہے، ورنہ ایسے لوگوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جو بڑی بڑی ڈگری ہاتھوں میں تھامے پھرتے ہیں اور اخلاق کے مفہوم تک سے واقف نہیں۔ ان کی شخصیت میں علامت نگاری کی دھن، نفسیاتی اور فلسفیانہ پیچیدگیاں اور ان میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کوئی دوسری ہی ہجرت کی داستان پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

''امتیاز نامہ'' اس بات کی برملا علامت ہے کہ ہر نئی چیز، نئی راہ، نئی بات خواہ وہ کسی بھی رنگ میں ہو پس نظر میں مشکوک ہی نظر آتی ہے۔ اَن دیکھے کا اظہار، اَن دیکھے جنگل کا سفر، پُرخطر ہو سکتا ہے لیکن اَن دیکھنے کا شوق، نہ معلوم کا کھوج لگانا حوصلے والوں کا کام ہے۔ وہ صعوبتیں برداشت کرنے کی سکت رکھتے ہیں۔ نئی دنیا کی تلاش میں تین ہجرتیں، ادب کے باب میں نیک فال ہے۔

جناب امتیاز گلیانوی کے تجربے، درسی نہیں ہیں باقاعدہ غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی یادداشتیں ہیں، جو کسی انتہا پسندی کا اسیر نہیں، گروہ بندی کے اثرات سے باخبر ہے۔ ان کی اڑان ایک آزاد پرندے کی سی ہے، جو جہاں اور جس طرح چاہے اڑتا ہے۔ ان کے لیے ضروری نہیں کہ روایت کے قیدی ہو کر رہ جائیں ان کو روایت کا شعور ہے اور انھوں نے روایت کو ہی آگے بڑھانے کی جرأت کی ہے۔ یہ جس جذبے کے ساتھ آگے اور آگے بڑھے ہیں۔ اس سے ان کے عزائم کا علم ہوتا ہے ان کا اپنا ایک نظریہ ہے انھیں یقین ہے کہ ان کے نظریے میں وسعت اور سچائی ہے۔ انھیں یہ بھی علم ہے کہ ان سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک خوب صورت کتاب ہے جس میں ہمیں ایک مکمل عہد ملتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے پیارے حبیب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی آل کے صدقے، ان کی تحریر میں اور نکھار پیدا کرے۔ (آمین)

☆☆☆☆☆

# نذر عابد کی نعت گوئی: برگِ نعت کے تناظر میں

راحیلہ خورشید

میں نعت لکھنے کے قابل کہاں ہوا عابد
سو خود سے یوں بھی لڑا ہوں میں نعت لکھتے ہوئے

.....

نعت گوئی کے چمن میں عقیدت کے پھول کھلانے والے اکثر شعرا نے حمدیہ کلام بھی تحریر کیا۔ یا حمد لکھنے والے شعرا نے لفظ لفظ سے اظہار عقیدت کر کے نعتیہ کلام بھی لکھا۔ مگر حمد گو شعرا اس سُقم سے بری رہے کہ انھوں نے رب تعالیٰ کی صفات، عظمت اور بڑائی کو جس قدر چاہا بڑھا کر پیش کیا مگر حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، کی وجہ سے ہمیشہ تشنگی کے احساس میں ڈوبے رہے۔ جبکہ دوسری جانب نعت گو شعرا کے لئے ربوبیت اور رسالت میں احتیاط برتنا دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف تھا۔ کیوں کہ عبد اور معبود میں امتیاز روا نہ رکھنا گستاخی کے منافی ہے اور گستاخی بھی اس نوعیت کی کہ انسان بے خبری میں گناہ عظیم کا مرتکب ٹھہر جاتا ہے - رحمت اللعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شمائل و فضائل کے بیان میں آپؐ کے اعلیٰ وارفع مقام و مرتبے اور بڑائی سے انکار ممکن نہیں ہے مگر اس عظمت اور بڑائی کو ربوبیت سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نعت گوئی کو مشکل ترین صنفِ سخن کا درجہ دیا گیا ہے کیونکہ اس کے لیے جس احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ہر شخص اس احتیاط کا روادار نہیں۔

نذر عابد بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ آپ نے غزل کو پوری روایت کے ساتھ برتا اور جو کچھ کہا نہایت سادہ اور سلیس زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اور جب نعت گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ تو بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے نعت گوئی کے فن کو احسن طور پر نبھایا ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری پر مشتمل کتاب ''برگِ نعت'' منظر عام پر آ چکی ہے۔ آپ نے اپنی نعتوں میں رسول مدنی و عربی کے شمائل و خصائل کو نئے زاویے، نئے قرینے اور اچھوتے اسلوب کے ساتھ بیان کیا:

پھر قلم پر کھلا راستہ نعت کا
پھیلتا ہی گیا سلسلہ نعت کا

.....

نذر عابد جس انداز سے نعت کے چمن میں آپؐ سے عشق اور عقیدت کے پھول کھلاتے ہیں، ان کی مہک دلوں کو منور کرتی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر عشقِ محمد کہیں بھی عشقِ باری تعالیٰ سے متصادم نہیں ہوا۔ ہلکہ نذر عابد صاحب نعت گوئی کی لذت سے آشنائی کے بعد بے خبری سے آگہی تک کے سفر در سفر سے گزرتے چلے گئے، کہ یہی اس فن کی معراج ہے:

بے خبر تا آگہی کا ہر در یچہ مجھ پہ وا تم نے کیا
میں اندھیرے میں کھڑا تھا روشنی سے آشنا تم نے کیا

.....

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کونین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ آپ کی آمد سے پہلے دنیا ضلالت و جہالت میں ڈوبی ہوئی تھی خدا سے بے خبر، خود سے بے خبر، مقصد حیات سے بے خبر۔ آپ کی آمد سے ازل سے ابد تک انسانیت سنور گئی۔ رسول انقلاب کی تعلیمات کے نور سے تخلیق کائنات کا مقصد اپنی تکمیل کو پہنچا۔ نذر عابد نے اپنے کلام میں آنکھ ہونے کے باوجود سب منظر اور مظاہر کو نہ دیکھنے کی سکت رکھنا اور پھر نبی آخر الزمان کی برکت سے نوع انساں کی نظر کو پُر بصیرت اور پُر ضیا کرنے کے موضوع کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے:

آنکھ تھی پر سب مناظر، سب مظاہر اس کی قدرت میں نہ تھے
نوع انساں کی نظر کو پُر بصیرت، پُر ضیا تم نے کیا

.....

عشق پابندیوں کا قائل نہیں عشق ہو اور ساتھ پابندی بھی ہو، عشق ہو اور احتیاط کا دامن بھی تھاما جائے۔ ایسا بہت کم نظر آتا ہے۔ مگر نذر عابد نے اللہ کے عشق میں شیفتگی اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق میں وارفتگی کے اظہار میں حد فاصل کو ملحوظ خاطر رکھا۔ ثنا خوانی کے بنیادی جزو عقیدت اور حفظ مراتب کے صحرا میں خود کو بھٹکنے نہیں دیا۔

ممدوح رب! میں کیا کہوں باب صفات میں
قرآن بولتا ہے تیری بات بات میں

.....

شاعری کی تنگ گھاٹیوں کو عبور کرتے ہوئے جن امور کو نہایت اہم گردانا جاتا ہے۔ ایک شاعر کا فکر و خیال اور پھر اس فکر و خیال کی ادائیگی کا سلیقہ۔ کیوں کہ شاعری میں اصل لذت ہی سلیقہ اظہار کی ہے ورنہ تو دنیا میں کوئی موضوع، کوئی بات نئی نہیں ہے۔ بقول سیف الدین سیف:

سیف انداز بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

.....

نذر عابد کا فکر و خیال اور پھر اسے ادا کرنے کا سلیقہ ان کے کلام کو منفرد اعزاز بخشتا ہے اور ان کے اہم شاعر ہونے کا معیار بھی متعین کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک بہترین

اور معیاری نعتیہ مجموعہ تحریر کر کے اردو ادب کے وقار میں اضافہ کیا۔ الفاظ کے چناؤ، جدت طبع، فنی جمال، طرز ادا کا کمال اور پھر الفاظ برتنے کی عمدگی، شاعرانہ مہارت اور پختگی کی بہترین دلیل ہے۔

مثنوی سیرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عہد عرب میں چھائی جہالت کی زندہ تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد رحمت باری کا جوش میں آنا اور پھر وادی بطحا سے نور کی بارش برسنا، اور پھر نبیؐ کریم کو آغاز رسالت میں پیش آنے والی رکاوٹوں کا ذکر نہایت آسان پیرائے میں کیا گیا ہے۔

کوہ فاران کی چوٹی سے بلایا سب کو
حق کا پیغام محبت سے سنایا سب کو

.....

مثنوی میں شاعر نے سیرت النبیؐ سے مربوط تمام موضوعات اور تاریخی واقعات کا اس قدر بہترین انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔ کہ تمام مناظر نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں۔

سُورما جتنے بھی بیٹھے تھے وہ خاموش رہے
سر بہ زانو تو کئی چہرہ بہ آغوش رہے

.....

گھر سے نکلے تو کئی ہاتھ تھے تیغیں تانے
دستِ قدرت نے بکھیرے بھی تانے بانے

.....

نبی کریم ہدایت اور نجات کا وسیلہ ہیں وہ کڑی سے کڑی دھوپ میں ہمارے لیے سائبان کی حیثیت اختیار کرتے ہیں نذر عابد نے اسی موضوع کو کس قدر دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے کہ مصیبت کی گھڑی میں آپ کا ساتھ ہی انسان کو مضبوطی عطا کرتا ہے:

جب بھی درپیش مصیبت کی گھڑی ہوتی ہے
آپ کی ذات میرے ساتھ کھڑی ہوتی ہے

.....

حضورؐ کے شمائل، خصائل اور فضائل بیان کرنا خون جگر کو پانی کرنا ہے اور اگر نعت تحریر کرتے اپنی خطاؤں کا بھی ادراک ہونے لگے تو یہ عمل اور کٹھن ہوجاتا ہے، شاعر بھی اپنی داخلی کیفیت کا بھرپور اظہار کرتے ہیں کہ آپؐ کی تعریف و توصیف بیان کرنے کے دوران یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں زمین میں گڑا ہوں:

خطائیں اپنی جو سوچوں تو کانپ اٹھتا ہوں
زمین کے بیچ گڑا ہوں میں نعت لکھتے ہوئے

.....

بحیثیت مجموعی نذر عابد کا نعتیہ کلام موضوعات کے اعتبار سے وسعت کا حامل ہے، وہ عشق رسول کے اظہار میں احترام، شائستگی اور حق گوئی کے انداز کو اپنا کر آزاد روی کے بجائے پابندی کی شاہراہ پر گامزن ہیں، جو ان کی شاعرانہ عظمت کی بہترین دلیل ہے۔

نعت لکھنا ، نعت پڑھنا کچھ نہیں معتبر ہے بس ، سماعت آپ کی

☆☆☆☆☆

# سید ناصر شہزاد ___ منفرد اسلوب کا قابلِ توجہ شاعر

شعری تخلیق کے حوالے سے سید ناصر شہزاد کا نام برصغیر پاک و ہند میں اپنی منفرد پہچان کا حامل ہے انھوں نے شاعری کی ابتدا 1958 میں کی اور آغاز ہی میں چونکا دینے والی شاعری تخلیق کر ڈالی اُن کا پہلا مجموعۂ شاعری ''چاندنی کی پتیاں'' کے نام سے جولائی 1965 میں شائع ہوا جس کا سرورق حنیف رامے نے بنایا تھا اور اس کتاب کا انتساب اُنھوں نے مجید امجد کے نام کیا تھا اس مجموعۂ شاعری کی اشاعت نے شعری اور ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا تھا سید ناصر شہزاد کا یہ شعر شروع ہی سے میرے حافظے کا حصہ بن گیا—

زندگی جب بھی کسی شے کی طلب کرتی ہے
مرے ہونٹوں پہ ترا نام مچل جاتا ہے

.....

ناصر شہزاد کی غزل کی طرح اُن کے گیتوں میں بھی خاص قسم کی غنائیت اور رچاؤ نظر آتا ہے انھوں نے اپنی شاعری میں ہندی لفظیات کے ملاپ سے جو اسلوب اپنایا وہ جدید بھی ہے اور منفرد بھی--- اپنی اسی انفرادیت کی بنا پر اُنھوں نے اپنے آپ کو بین الاقوامی سطح پر منوایا مجید امجد کے بقول ''ناصر شہزاد کی شاعری مہجور روایتوں کا شیون ہے'' آلِ احمد سرور کے بقول گیت میں پہلا نام بھی ناصر شہزاد کا ہے اور آخری بھی--- انتظار حسین نے کہا'' کہ ناصر شہزاد کا شعری سفر ایک مکمل تہذیب سے دوسری مکمل تہذیب کے ساتھ سنجوگ کا سفر ہے'' غزل کے اہم شاعر سید شوکت ہاشمی نے یوں اظہار کیا ''فراق گورکھپوری کے بعد ناصر شہزاد وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے یہاں کے سماج اور موسمی مزاج کو پوری ہنرمندی سے شعر میں رواج کیا ہے'' ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ بھرپور ضخامت

علی رضا

کے ساتھ ''بن باس'' کے نام سے 2004 میں منصۂ شہود پر آیا جسے پاکستان کے علاوہ بیرون ملک بھی بہت پزیرائی حاصل ہوئی سید ناصر شہزاد کی نثر بھی ایک خاص قسم کے حُسن سے آراستہ ہے اُنھوں نے بہت خوبصورت انداز میں یہ کام آگے بڑھایا ہے مجید امجد کی زندگی اور شاعری کے حوالے سے اُن کی زندگی کے آخری برسوں میں شائع ہونے والی اُن کی نثری تصنیف ''کون دیس گئیو'' بھی خاصے کی چیز ہے اس میں اُنھوں نے مجید امجد کی نظموں کے پس منظر میں رونما ہونے والے بہت سے واقعات کو ذاتی یاداشت کے تناظر میں بہت عمدگی سے بیان کیا ہے اور اصل حقائق پیش کیے ہیں سید ناصر شہزاد نے اپنی اردو شاعری میں ہندی لفظوں کے ملاپ سے جو اسلوب دیا ہے وہ منفرد بھی ہے اور اچھوتا بھی----

سید ناصر شہزاد کی شاعری ہندی لفظوں کے ملاپ کی وجہ سے منفرد اُسلوب کی حامل ہے اپنی اسی انفرادیت کی بنا پر انھوں نے بین الاقوامی سطح پر اپنے آپ کو منوایا—

مجید امجد کے شاگرد ہونے کے ناطے سے بھی ان کی تخلیقات خاص قسم کے حُسن کی آئینہ دار ہیں برصغیر پاک و ہند میں ان کا نام گیت نگاری اور اردو غزل کی شعری روایت میں ہندی لہجے کی آمیزش کے حوالے سے برسوں یاد رکھا جائے گا میں نے اُن کے سانحہ ارتحال کے موقع پر نامور اہلِ قلم سے اُن کے حوالے سے آرا اکٹھی کیں جو پیش خدمت ہیں -----

ممتاز ادبی شخصیت ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا 'ناصر شہزاد دورِ حاضر کا ہم ترین گیت نگار تھے اُن کی غزل میں بھی گیت کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی--- سرزمین وطن اور اُس کی ثقافت کو اُنھوں نے فکر اور احساس کی سطح پر اپنے اعماق میں اس طور جذب کر لیا تھا کہ اُن کی شخصیت بجائے خود ایک گیت کی طرح لو دینے لگی تھی اُن کے اچانک رخصت ہو جانے سے یوں لگتا ہے جیسے اردو شاعری کا سیلِ رواں رُک سا گیا ہو میرا اور اُن کا عمر بھر کا ساتھ تھا مجھے اُن کے چلے جانے کا جو دکھ ہوا ہے اُسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا'---- ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اُن کے حوالے سے لکھا 'وہ انتہائی منفرد شاعر تھے غزل اور گیت کی اصناف میں اُنھوں نے جو تجربات کیے وہ اتنے واضح ہیں کہ اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہیں گے شاعری کے علاوہ مجید امجد پر اُن کی تصنیف ''کون دیس گئیو'' مواد کے وفور کے اعتبار سے لاجواب کتاب ہے اور مجید امجد کی شخصیت اور فن کے بارے میں زندہ و تابندہ تصنیف--- مجھے یقین ہے کہ ناصر شہزاد پر بہت کچھ لکھا جائے گا جدید شاعری میں اُن کا مقام بہت بلند ہے''--- پروفیسر ڈاکٹر خواجہ مہدی حسن نے لکھا ''ناصر شہزاد (مرحوم) سکول کالج میں میرے

ساتھی رہے ہیں اور اُنھوں نے شاعری کی ابتدا گورنمنٹ کالج منٹگمری میں تعلیم کے دوران ہی کر دی تھی اور کالج کی معروف ادبی انجمن لٹریری سرکل کے ہفتہ وار اجلاسوں میں اپنی شاعری کی وجہ سے مقبول تھے اُنھوں نے بہت سے نوجوانوں کی طرح شاعری کو صرف نوجوانی کے زمانے کا وقت گزارنے کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اس فن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا لیا اور سنجیدگی سے غزل اور گیت آخری عمر تک کہتے رہے اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں اپنا مقام پیدا کیا''--- نامور شاعر شہزاد احمد نے لکھا ''مجید امجد تو خیر تھے ہی حاجی بشیر احمد بشیر گوہر ہوشیار پوری اور دوسرے کئی دوست ایسے ہیں جنھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا ناصر شہزاد نے ہندی روایت کو اپنایا تھا مگر اس ہندی روایت میں فارسی کا طرزِ احساس بھی شامل تھا وہ اپنے عہد کے نمایاں مشاق اور صاحبِ طرز شاعر تھے کاش کوئی اُن کی روایت کو آگے بڑھا سکے'' ممتاز محقق نقاد اور شاعر پروفیسر ڈاکٹر سہیل احمد نے لکھا'' ناصر شہزاد کے گیتوں اور غزلوں کا اپنا لسانی سانچہ تھا اور ان کے تلازمات روایتی غزل کے تلازمات سے بالکل الگ تھے اور ہندی کے اثر سے ان میں ایک مٹھاس پیدا ہو جاتی تھی ناصر شہزاد کے انتقال سے ساہیوال اور اردو ادب اپنے ایک بانکے شاعر سے محروم ہو گیا--- ''ممتاز محقق، نقاد اور شاعر ڈاکٹر خورشید رضوی نے لکھا''

ناصر شہزاد اپنی شخصیت اور شاعری دونوں میں ایک البیلے اور من موہنے انسان تھے سب سے محبت کرنے والے اور اپنی دنیائے خیال میں مست رہنے والے اُنھوں نے اپنی شاعری خصوصاً اپنے گیتوں میں ایک نیا انگ اور رنگ نکالا ناصر شہزاد کے جانے سے شعر و ادب کا ایک مخصوص رنگ ختم ہو گیا اُن کو مجید امجد کی ذات اور فن سے جو گہرا لگاؤ تھا وہ بھی میرے اور اُن کے تعلق کا ایک مضبوط حوالہ تھا---'' ڈاکٹر انور سدید نے لکھا'' ناصر شہزاد نے شاعری میں غزل اور گیت کی صنف کو قبول کیا اور اُس نے ان اصناف کا روایتی اسلوب اختیار کرنے کے بجائے ایسا انداز اختیار کیا جو اس کے باطن کی تمام کیفیات کو ہی نہیں بلکہ مشاہدات اور تجربات کی وسعت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ سکتا تھا'' ڈاکٹر سعادت سعید نے لکھا'' ناصر شہزاد کی شاعری کا خمیر برصغیر ہند و پاک کی ہزار سالہ مشترک روایات سے اُٹھا تھا اُنھوں نے عشق و محبت کے حوالے سے میسر آنے والی لوک میراث سے بھرپور استفادہ کیا وہ اردو شاعری کے ہندوی مزاج کو برتنے والے معدودے چند شعرا میں سے تھے----

اُن کا انتقال 70 برس کی عمر میں اوکاڑہ سے ملحقہ اُن کے آبائی قصبہ شیخوشریف میں ہوا اور اُن کی آخری آرام گاہ بھی وہیں ہے ----

☆☆☆☆☆

# اکبرالہ آبادی کی تاریخِ ولادت پر اُن کی فکر کے چند زاویوں کا مختصر جائزہ

مغرب کی مادی ترقی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے والے بڑے بڑے دانشوروں اور مفکروں کے نظریات کا رَد کرنے والی شخصیت لسانُ العصر جناب سید اکبرالہ آبادی کا آج یومِ ولادت ہے۔ اکبرالہ آبادی کی تاریخِ پیدائش مختلف کتب میں مختلف درج ہے۔ کلیاتِ اکبر مرتب کردہ رانا خضر سلطان جو کہ مکتبہ بک سٹال لاہور سے شائع ہوئی اُس میں سید اکبر کی تاریخِ ولادت اکتوبر 1845 درج ہے۔ لیکن دیگر تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے اکبر کی تاریخِ ولادت 16 نومبر 1846 ہے۔ خواجہ محمد زکریا صاحب بھی تاریخِ ولادت کے حوالے سے اسی پر متفق باتحقیق دکھائی دیتے ہیں۔ بڑی شخصیات جب بھی پیدا ہوں اُن کا رتبہ و مقام اس کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔ اصل چیز ان کا پیغام اور فکر ہے جو انھوں نے مخلوقِ خدا تک پہنچائی۔ اکبرالہ آبادی کا نام سید اکبر حسین رضوی اور تخلص اکبر تھا۔ آپ کی جائے پیدائش موضع بارہ ضلع الہ آباد ہے۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام سید تفضّل حسین تھا جو نیک سیرت دین دار انسان تھے اور عربی اور فارسی میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ اکبر نے ابتدائی تعلیم والد ہی سے حاصل کی۔ ہمارا مقصد اکبر کی مکمل زندگی کا احاطہ نہیں بلکہ اپنی تحریر کے ذریعے ان کی فکر کے مخصوص پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ہے۔ تاریخ کا جبر اور ستم ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ یہ طاقتور حلقوں اور غالب رجحانات کی غلام رہی ہے۔ جو لوگ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں وہ معتبر قرار اور مخالفت کرنے والوں کو کم تر قرار دیا جاتا ہے۔ یا اُن کی اصل فکر اور نظریات کو کچھ ایسے انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اُن کا پیغام دَب کر رہ جائے اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکے۔ لیکن جونہی جبر کا دور ختم ہوتا ہے حقیقی فکر اپنا سر اُٹھا کھڑی ہوتی ہے اور اپنی مسلمہ حقیقت کو تسلیم کروا کر رہتی ہے۔

اکبرالہ آبادی اُن شخصیات میں سے تھے جنھیں اُس دور کی غالب فکر اور اُبھرتی ہوئی تہذیب کے پجاریوں کے خلاف الم بغاوت بلند کرنے کے باعث وہ پزیرائی نہیں دی گئی جس کے وہ اصل حق دار ہیں۔ بلکہ موجِ کوثر میں شیخ محمد اکرم جیسے مورخین تک نے اُن کو فقط مزاحیہ شاعر قرار دے کر اپنے بغض کا ثبوت دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ فکری لحاظ سے بلند پایہ تعمیری مفکر نہ تھے۔ یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں کیوں کہ ہر چڑھتے سورج کا پجاری ایسا ہی کہہ سکتا ہے۔ وہ

حسنین احمد

سمجھتا ہے کہ سورج ہمیشہ رہے گا۔ لیکن جونہی سورج غروب ہوگا اکبر کا نام رہ جائے گا شیخ صاحب کا نہیں۔ اکبر کی مزاحمت کسی شخصیت سے ہرگز نہیں تھی بلکہ اس ابھرتی ہوئی فکر سے تھی جو مشرقی اور اسلامی تہذیب کو بدل دینے کے لیے قوم میں انجیکٹ کی جا رہی تھی۔ اکبر کی فکر اور وسعتِ نظری کا اعتراف علامہ محمد اقبالؒ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس کا عملی ثبوت ان کی شاعری کا ظریفانہ حصہ ہے جو انھوں نے اکبر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا۔ اس میں اکبر کا رنگ بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ اور اکبر کی فکر تو اقبال کی شاعری میں جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ علم وہ بنیادی چیز ہے جو کسی قوم کی فکری تعمیر کا سبب ٹھہرتی ہے۔ اکبر اس فلسفے کو بخوبی سمجھتے تھے۔ جب قوم کے نام نہاد مفکر مغرب کی تعلیم کے حصول کی تبلیغ کرتے دکھائی دے رہے تھے اکبر کی فراست دیکھ رہی تھی کہ اس کے نتائج کیا برآمد ہوں گے۔ اور جو جو باتیں اکبر نے کہیں وہ دورِ حاضر میں سچ دکھائی دیتی ہیں۔ رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

.....

سید اکبر کے اس ایک شعر کو ہی دیکھ لیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ موجودہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے والے اپنے اجداد سے کس حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ اپنے لباس سے لے کر ہر طور طریقے میں اپنی تاریخ اور آباؤ اجداد سے مختلف قوم دکھائی دیتی ہے۔ جوں جوں تعلیم بڑھ رہی ہے اس قوم میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لباس ہی کو دیکھ لیں تو مغربی لباس ہمارے پچھلوں یا آبا کا نہیں رہا اور نہ ہی ہمارے خطے کا یہ کلچر رہا ہے۔ اکبر جانتے تھے کہ تعلیم ذہن سازی کرتی ہے اور جس کی تعلیم لی جائے انسان اس کی غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ مالک کی ہر چیز قابلِ تکریم بن جاتی ہے اور غلام کی ہر چیز حقیر۔ اپنے لباس تک کو موجودہ نسل باعثِ شرمندگی سمجھتی ہے اور جن کی تعلیم حاصل کر رہی ہے ان کا لباس جو ہمارا کلچر و ثقافت ہے نہ آباء کا طور، اسے اپنانے پر فخر سمجھتی ہے۔ جبھی اکبر کہتے تھے کہ:

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مزید کہتے ہیں کہ:

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

.....

اکبر کا خیال تھا کہ جس تعلیم کا مقصود مسلمان کے دل سے آخرت کی فکر نکال کے دنیا کے حصول کی لگن کو پروان چڑھانا ہو وہ دل کو طاہر نہیں رہنے دیتی۔ دل نفسانی خواہشات سے بھر جاتا ہے اور انسان دنیا کے حصول کی تگ و دو میں لگ جاتا ہے اور اپنے حقیقی مقصد یعنی آخرت کی فکر سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے لگتا ہے:

علوم و نیوی کے بحر میں خوطے لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

حضورِ قلب اگر حاصل نہیں تجھ کو تعجب کیا
خدا جب دل سے غائب ہو تو دل حاضر نہیں ہوتا

.....

اکبر الٰہ آبادی مغربی تعلیم کے رجحانات و اثرات کو خواتین میں بڑھتا دیکھ کر جس نتیجے کو بیان کرتے ہیں وہ بھی بعین سچ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مذہبی و تہذیبی روایات سے وہ خواتین کو دور ہوتا دیکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مغربی تعلیم کے حصول سے خواتین بھی اپنی اقدار و روایات سے دور ہو جائیں گی:

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

.....

اکبر خواتین کو اسلامی تعلیمات اور مشرقی روایات کے تحت گھر میں رکھنے کے قائل ہیں۔ اکبر کا ماننا ہے کہ خواتین کی عزت کی جگہ اُن کا گھر ہے۔ بازاروں کی زینت بننے سے عورت کا مقام کم ہوتا ہے۔ اس شعر میں شمع اور چراغ کی جو اصطلاح استعمال کرتے ہیں یہ اپنے معنی کے لحاظ سے ہی بہت دلکش ہے اور مفہوم کو وضاحت سے بیان کر دیتی ہے۔ شمع کی نسبت ہمیشہ محفل و مجلس سے کی جاتی ہے۔ اور چراغ کا تعلق گھر سے ہوتا ہے۔ گھر میں بھی طاق میں اس کی مخصوص جگہ ہوتی ہے۔ اور چراغ کی خوبصورتی بھی یہ ہے کہ اسے گھر میں ایک مخصوص جگہ دی جاتی ہے جو کہ شمع کو میسر نہیں ہوتی۔ چراغ کے لیے باقاعدہ طاقچہ بنایا جاتا۔ گھر کو روشن کرنا چراغ کا کام ہوتا ہے اور تمام گھر اس کی روشنی سے منور ہوتا ہے۔ خواتین بھی گھر کے معاملات میں نور کا کام کرتی ہیں۔ جب بازار کی زینت بن جائیں تو گھر کے معاملات سرانجام دینا ممکن نہیں رہتا جس پر موجودہ عہد صادق ہے۔ اکبر الٰہ آبادی اس مغربی تعلیم سے برآمد جس نتیجے کا ذکر کرتے ہیں وہ بھی ہم دورِ حاضر میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے بھی اکبر کی فراستِ فکر سے بخوبی آگاہی حاصل ہو جاتی ہے:

امنگیں طبع میں ہیں، شوقِ آزادی کا بلوا ہے
کھلیں گے کل تو دیکھو گے، ابھی کلیوں کا جلوہ ہے

مزید فرماتے ہیں:

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
دل کش و آزاد و خوشرو، ساختہ پرداختہ

یہ تو کیا معلوم کیا موقعے عمل کے ہوں گے پیش
ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بے ساختہ
ان سے بی بی فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

.....

مغربی تعلیم کے نتائج جو مغرب کی تہذیبی شکل میں خواتین میں بھی نظر آ رہے ہیں اکبر پہلے بتا چکے:

پتلون میں وہ تن گیا، یہ سائے میں پھیلی
پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اُتارا

.....

اکبر خواتین کی تعلیم کے متعلق جس نظریے کے قائل تھے وہ بھی اُن کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے سید اکبر کہتے ہیں کہ:

تعلیم عورتوں کی ضروری تو ہیں مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

وہ اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اکبرالہ آبادی کی فکر کے تمام زاویوں کا احاطہ ایک تحریر میں کرنا ممکن نہیں۔ نہ ہی اس تحریر کا مقصد ان کی شاعری اور فکر کا مکمل احاطہ کرنا ہے یہ تو فقط اس عظیم فکر کے حامل مفکر کو ان کی تاریخ ولادت پر خراج تحسین پیش کرنے کی ایک کاوش ہے۔ سید اکبرالہ آبادی کی فکر کو سمجھنے کی خاطر اُن کے کلام سے چند نمونے پیش ذیل ہیں:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

چھوڑ لٹریچر کو، اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر، اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کر کلرکی کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھول جا
رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

شمشیر زن کو اب نئے سانچے میں ڈھالیے
شمشیر کو چھپایئے، زن کو نکالیے

.....

اکبرالہ آبادی کی نظم "نئی تہذیب" اُن کی فکر کو سمجھنے کے لیے ایک مکمل نظم کہی جاسکتی ہے۔ آخر میں یہ نظم پیش کر کے اپنی بات کو مکمل کرتے ہیں۔

## نئی تہذیب

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا بیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہوں گے
نہ پیدا ہوگی خط نسخ سے شان ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیب رقم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی
کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال و سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغات مغربی بازار کی بھاشا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

.....

زندگی بخیر اکبر کی فکر کے مزید پہلوؤں کو بیان کرتا رہوں گا۔ اللہ کریم اکبرالہ آبادی کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں بطور قوم اپنے حقیقی رہنماؤں کی قدر اور پہچان کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

☆☆☆☆☆

# یہ جو لاہور سے محبت ہے

آنکھ سے اشک نہ برسیں تو بھلا کیا برسے
شہر کو دیکھ لیا ہم نے دھواں ہوتے ہوئے..

..........................

عرصہ گزرا کہ بابا جی اشفاق احمد نے کہا تھا کہ کسی بابے کو ڈھونڈنا ہو تو اسکے لئے نظر ہونی چاہئے ... ضروری نہیں کہ وہ تسبیح گلے میں لٹکائے، لمبا چولا پہنے، اللہ ہو اللہ ہو کر رہا ہو.. وہ پینٹ کوٹ اور ٹائی میں ملبوس آفس میں بیٹھا ظاہرا دنیا دار انسان بھی ہو سکتا ہے.. بالکل اسی طرح ضروری نہیں کہ جو روایتی انداز میں لمبے بال بڑھا کر، کارِ دنیا چھوڑ کر، سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے ہوئے شعر کہے وہی شاعر ہے، بلکہ وہ کسی میڈیکل کالج میں بیٹھا سوئی سے خار نکالتا ہوا کوئی ڈاکٹر بھی ہو سکتا ہے.

فخر عباس صاحب کی کتاب "یہ جو لاہور سے محبت ہے" پڑھنے کا اب موقع ملا... اور خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس دور میں جب کہ ہر کوئی جدت کے نام پر شاعری کو بے آبرو کر رہا ہے، انتہائی گھٹیا مضامین پہ داد وصول کرنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے، کوئی شخص مومن کے سہلِ ممتنع کا علم تھامے اتنی دلکش شاعری بھی کر سکتا ہے...!!

فخر عباس صاحب کی شاعری کی امتیازی خاصیت یہ ہے کہ وہ جدت پسندوں کی طرح لمبی لمبی اور دور کی کوڑیاں ڈھونڈھ کے نہیں لاتے، جو کچھ انکی ذاتی زندگی میں، ان کے اطراف میں اور انکے شہر میں ہو رہا ہے اسی کو خوبصورت الفاظ میں ڈھالنا ہی انکی شاعری ہے...

وہ اپنی ذاتی زندگی کے معمولات تک کو شعروں میں سموتے ہیں:

میں ڈاکٹر ہوں، بھروسے کے اس تعلق سے
کسی بھی وقت مجھے تو جگا لیا گیا ہے......

محمد کامران محور

کتب لکھنے کے بعد وہ آسماں پر نہیں پہنچے
بلکہ عاجزی بدرجہ اتم موجود ہے

کیوں ڈھونڈتے پھرتے ہو فرشتہ میرے اندر
بھیجا ہے خدا نے مجھے انسان بنا کر.....

اور

زمین اس لئے بھی حوالہ ہے میرا
فلک کا بھی ہے اک کنارہ زمیں پر

وہ اپنے گردونواح میں چلی جارہی پستی اور
سوانح پہ بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں

مردہ ضمیر شخص ہی بس رہ سکے یہاں
کیسا اصول زندگی تیرے نگر کا ہے ..

حادثوں کا دور ہے، اور حادثہ تو یہ بھی ہے
بچ گیا میں، یار میرے چار سو مارے گئے

زندگی کے حقائق بھی ان پہ روز روشن کی
طرح عیاں ہیں:

آدمی صبر سے نکھرتا ہے
زندگی حوصلے سے بنتی ہے

زندہ رہنا میرے بس کی بات نہیں
میں بس اپنا عہد نبھاتا پھرتا ہوں

ایک دنیا تھی انتقال سے قبل
ایک دنیا ہے انتقال کے بعد

انکی زندگی کے ذاتی واقعات بھی انکی شعری
بنیاد میں شامل ہیں،، اور وہ زندگی کے تلخ
حقائق کو خوب سمجھتے ہیں:

تمہیں گھر بسانے کی جلدی تھی شاید
مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے

مل تو جاتے ہیں بہت،، ساتھ نبھانے والا
ایک ہی شخص میری جان ہوا کرتا ہے ..

محبت کے لطیف احساسات سے بھی وہ
آشنا ہیں اور انہیں بتانا خوب جانتے ہیں..

غالب و میر کے لہجے میں بیاں ہوتے ہوئے
ہم نے دیکھا اسے بچپن سے جواں ہوتے ہوئے

اسکے اک لفظ پہ میں دیر تلک رویا ہوں
آج پھر اس نے محبت کی سخاوت کی ہے

الٹا مجھ کو ہوئی پشیمانی .....
وہ تو چپ تھا مرے سوال کے بعد

.....

الغرض ایسے شعرا کا ہونا غنیمت ہے جو انسانی
زندگی اور اس کی منسلک پہلوؤں کو شعروں
میں پرونے کا ہنر رکھتے ہیں... آخر میں انکا
یہ شعر جو انکے تخلیقی مراحل کی عکاسی کرتا ہے

ڈھونڈھ کر بے شمار بیٹھے ہو
کیا غزل قافیے سے بنتی ہے ؟؟

☆☆☆☆☆

# شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

## وہ تیرگی جو میرے نامہ سیاہ میں تھی:

دن مزے سے کٹ رہے تھے۔ عمدہ لذیذ کھانے، آرام دہ اور سکون آور ماحول دوستوں سے خوش گپیاں، سیر و تفریح، ایک اعتبار سے تین سال کی مسلسل محنت، کوفت اور مشقت کا ثمر مل رہا تھا۔ محاوراتی ہی سہی روز و شب عید اور شب برأت لگتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے ایک بارگراں سر سے اُتار آیا ہوں۔ لندن پہلے بھی چند بار آ چکا تھا لیکن ایسی بات نہ تھی۔ لندن کا اگست ایک طرح سے بہار کا موسم ہوتا ہے۔ اس اثنا میں ڈاکٹر حسین بھی دو دفعہ کارڈف سے ملنے کے لئے آیا۔

اچانک اس خوشگوار ماحول میں ایک ناخوشگوار واقعہ رونما ہو گیا۔ پتہ نہیں فلک ناہنجار کو لوگوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں کیوں نہیں بھاتیں۔ راجہ مہدی علی خان نے اپنی مشہور پیروڈی، مثنوی قہرالبیان، میں اسے آسمان کی حرام زدگی کہا تھا۔ وہ بڑے لوگ تھے، لائسنس یافتہ اس قسم کی زبان استعمال کر سکتے تھے۔ ہم ایسی جسارت نہیں کر سکتے۔

دراصل ہوا یوں کہ میں کرام ویل ہسپتال میں اپنا ٹیسٹ کرا بیٹھا۔ رحیم یار خان تعیناتی سے قبل مجھے انجائنا کی تکلیف ہوئی تھی۔ اس کی نشاندہی ڈاکٹر اشفاق (مرحوم) نے مجھے شیخ زید ہسپتال کی ٹریڈ مل پر چلا کر کی تھی۔ نئی مشین آئی تھی اور میں اس کا پہلا شکار تھا۔ ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا، معمولی انجائنا ہے، دواؤں سے آرام آ جائے گا۔ چھ ماہ کے بعد میں نے پھر سے اس مشین پر سواری کی۔ حیرت سے ڈاکٹر کا منہ کھل گیا۔ کہنے لگا "My God! you ran like a marathon runner تمہیں کسی قسم کی دل کی تکلیف نہیں ہے۔ غالباً اس وقت کوئی لحاتی Spasm تھا۔" ساتھ ہی اس نے مشینی رپورٹ اور اپنا Opinion بھی دے دیا۔ اس کے بعد مجھے کبھی تکلیف نہ ہوئی۔ رحیم یار خان میں بھی شیخ زید ہسپتال تھا لیکن میں نے وہاں بھی کوئی ٹیسٹ نہ کروایا۔ اگر لوگوں کے کان میں بھنک بھی پڑ جائے کہ ڈی سی کسی قسم کے عارضے میں مبتلا ہے تو اس کی انتظامیہ پر گرفت کمزور پڑ جاتی ہے۔ ہر چند کہ ڈاکٹر اشفاق نے تحریری تسلی کرا دی تھی لیکن ایک کھد بد ہمیشہ میرے اندر رہی۔ سوئٹزر لینڈ میں پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اس شک میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ بطور حفظ ماتقدم اپنا ٹیسٹ کروا لیا جائے۔ یہاں بھی میں کافی دیر تک پھٹے پر چلتا رہا۔ کوئی خاص تکلیف محسوس نہ کی لیکن جب ماہر امراضِ قلب ڈاکٹر پیٹر ملز نے رپورٹ دیکھی تو اس نے تشویش کا اظہار کیا اور انجیوگرافی کا مشورہ دیا۔ رپورٹ دیکھی تو بائی پاس کرانا ضروری ہو گیا۔

ہم ۱۴ ستمبر کو امریکہ سے لندن پہنچے۔ کرامویل ہسپتال سے ملحقہ ہوسٹل میں پہلے سے ایک کمرہ بک کرا رکھا تھا۔ اس میں عموماً صحت یاب ہوتے ہوئے مریض یا ان کے تیماردار رہتے ہیں۔ لندن پہنچ کر پتہ چلا کہ وزیر صحت ملک سلیم اقبال مجھے ملنے کے لیے لندن میں رک گئے ہیں۔ ان کو سفارت خانے سے پتہ چلا۔ کرنل عطا کے علاوہ ملک اکرم وہاں کمرشل قونصلر تھے۔ ملک صاحب بھی تلہ گنگ کے رہنے والے ہیں۔ میرے والد صاحب کے دوست تھے۔ جب ہم

جوان ہوئے تو ہمیں برخورداری کے خانے سے نکال کر احباب کی مد میں لے آئے۔ جوش جی کی طرح انھوں نے بھی بوڑھا نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جوانی میں تلہ گنگ کے سب سے زیادہ خوبصورت آدمی تصور ہوتے تھے۔ محض اپنی فراست اور تجربے کی بنا پر وزیر بنے ہیں۔ خارزارِ سیاست میں طویل عرصہ تک آبلہ پا ہوئے۔ تلہ گنگ ٹاؤن کمیٹی کی ممبری سے جو شروع ہوئے تو پھر کہیں رکنے کا نام تک نہ لیا۔ زینہ بہ زینہ، منزل بہ منزل آگے بڑھتے گئے۔ سیاسی سفر کا آغاز سردار محمد حیات تمن کے گروپ میں شامل ہو کر کیا۔ جب سردار صاحب محمد خان ڈاکو سے ''ساز باز'' کے جرم میں گرفتار ہوئے تو یہ بھی دھر لیے گئے۔ سردار صاحب کی تو پولیس ''مزاج پرسی'' کرتی رہی لیکن انھیں کوئی جسمانی گزند نہ پہنچا سکی۔ قلعے تک بھی گئے لیکن پولیس وہاں بھی ان پر تفتیش کے نادر حربے نہ آزما سکی۔ ان کے بڑے بھائی اقبال ڈھال بن گئے۔ جیل سے واپس آئے تو باقاعدہ سیاست دان بن چکے تھے۔ جیسے جیسے سردار صاحب سیاسی طور پر زنگ آلود ہوتے گئے تو انھوں نے پیر صاحب مکھڈ سے پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔

وہ رات ہم نے ملک صاحب کی صحبت میں گزاری۔ لندن میں ان کی بڑی واقفیت تھی۔ جب بھی آتے کئی لوگ ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ ہم نے رات کا کھانا لاہوری ہوٹل میں کھایا۔ تندوری نان، چکن تکہ، سیخ کباب، مٹن چاپس، کریلے گوشت، لیمب روسٹ، جب ملک صاحب کے کسی دوست نے بل دینا چاہا تو مالک نے رقم لینے سے صاف انکار کر دیا۔ بولا ''میرے لئے بھی بڑا اعزاز ہے کہ صوبائی وزیر صحت نے قدم رنجہ فرمایا ہے۔ اس ریسٹورنٹ کے تو بھاگ جاگ اُٹھے ہیں۔''

جب میں ہوٹل پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ بیگم بڑی ناراض ہوئیں۔ کہنے لگیں ''کچھ تو خیال کرو۔ کل تم نے ہسپتال میں داخل ہونا ہے۔ دل کا آپریشن ہے، نازک معاملہ ہے۔ یہ رت جگے اور خوش خوراکی مضر صحت ہے۔ آخر جی میں کیا ٹھان رکھا ہے؟'' بات تو ٹھیک تھی، میں اُسے کیا جواب دیتا۔

آپریشن کے بعد میں ہسپتال میں ہی تھا کہ جنگ اخبار میں خبر چھپ گئی۔ ڈی سی رحیم یار خان کرامویل ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ ملاقاتیوں کا تانتا بندھ گیا۔ پھولوں اور تحفوں کی بھرمار ہو گئی۔ اکثریت کے ساتھ میری کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی لیکن اس عہدے میں جو کشش ہے، اس کا مجھے پہلی بار ادراک ہوا۔ ایک دن چند نوجوان آئے اور کہنے لگے ''اس جمعہ کو ہم

نے آپ کا فلاں ہال میں لیکچر رکھا ہے آپ ضرور تشریف لائیں۔ میں نے کہا بھائی! ابھی تو میں ٹھیک طرح سے چل پھر نہیں سکتا سانس لینے میں دشواری محسوس کرتا ہوں۔ تقریر کیسے کروں گا۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ڈیپٹی کمشنر بھی کبھی چلنے پھرنے سے معذور ہو سکتا ہے۔ شام کو میرے کزن صفدر ہمدانی لندن پیپلز پارٹی کی پوری ایگزیکٹو کمیٹی کو لے کر آ گئے۔ لندن میں صفدر کی جلاوطنی کا وہ دسواں سال تھا۔ ساری ایگزیکٹو کمیٹی غریب الوطن تھی۔ شاید صفدر کو مجھے ہسپتال میں دیکھ کر اتنا افسوس نہ ہوا ہوگا جتنا دُکھ مجھے اس سے مل کر ہوا۔ اس خاندان نے اپنی ساری زندگی پیپلز پارٹی کی خاطر تج دی تھی۔ اچھا خاصا کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ اس کے والد اکبر علی شاہ پرانے وقتوں کے تھانیدار تھے۔ مناسب حد تک زمینداری بھی تھی۔ بچپن میں یہ بڑا پیارا بچہ تھا، مجھ سے چھوٹا تھا۔ بھٹو کا ایسا شیدائی ہوا کہ خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ بھاگ کر لندن آ گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی دارا کو سات سال قید ہوگئی۔ بے نظیر جب پہلی مرتبہ لندن گئی تو اس کی سیکورٹی کا یہ انچارج تھا۔ ناہید خان اور ایک فوڈ انسپکٹر کی بے باک بیوی کو بھی اس نے بے نظیر سے متعارف کرایا تھا۔ کوئی شخص بے نظیر کو صرف صفدر کی وساطت سے ہی مل سکتا تھا۔ ان دنوں محترمہ کو ایک خدمت گار عورت کی ضرورت تھی اور اس کے لئے ناہید خان سے زیادہ موزوں عورت نہ مل سکتی تھی۔ درحقیقت بے نظیر کم عمر اور ناتجربہ کار تھی۔ بقول صفدر ہمدانی، رونے پر آتی تو گھنٹوں روتی رہتی۔ ناراض ہوتی تو دروازہ بند کر کے مورچہ بند ہو جاتی۔ اس کا لندن کے مضافات میں ایک بیڈ روم کا بوسیدہ سا فلیٹ تھا۔ پارٹی ورکرز جس قدر ہو سکتا خدمت کرتے رہتے۔ وہ اپنا کھانا خود پکاتی۔ صفدر بتانے لگا ''ایک دن میں گیا تو وہ فلیٹ میں نہیں تھی۔ میں باہر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر کے بعد ایک تھیلا اُٹھائے ہوئے آئی۔'' استفسار پر بتایا کہ وہ سبزی خریدنے مارکیٹ گئی تھی۔

میں نے کہا ''فلیٹ کے سامنے دکان ہے، اتنی دُور جانے کی کیا ضرورت تھی۔''

بولیں ''مارکیٹ سے رعیت (رعایتی) ملتا ہے۔'' صفدر کی آنکھیں بھرا گئیں۔ جو لوگ بھٹو کے بیرون ملک دولت کی باتیں کرتے ہیں کاش وہ آ کر اس کا طرز زندگی دیکھتے۔ بھٹو نے پیسہ بنایا اور نہ اس کا بیرون ملک کوئی اکاؤنٹ تھا۔ ان دنوں اخباروں میں آ رہا تھا کہ یہ لوگ فرانس کے مہنگے ترین علاقے کانز میں چھٹیاں گزارتے ہیں۔ صفدر نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ کانز میں ان کی کوئی

جائیداد یا جاگیر نہیں ہے۔ ان کی خالہ بہجت حریری ایران کی امیر عورت ہے۔ اس کا وہاں ولا ہے۔ یہ لوگ اسی کے پاس ٹھہرتے ہیں۔

سات دن کے بعد میں ہسپتال سے تو فارغ ہو گیا لیکن لندن نہ چھوڑ سکا۔ ٹانگ کا زخم بھر نہیں رہا تھا۔ ہر دوسرے روز پٹی کروانے کے لیے جانا پڑتا۔ ایک دن ڈاکٹر حسین آیا اور ہمیں چند روز کے لئے بلیک وڈ لے گیا۔ یہ قصبہ Gwnet county میں ہے اور کارڈف کے بالکل قریب ہے۔ ڈاکٹر وہاں پریکٹس کرتا تھا۔ صبح جب نرس پٹی بدلنے آئی تو میری بیوی نے اسے گہرے شک کی نگاہ سے دیکھا۔ اسے کہنے لگی ''میں بدل لوں گی تم تکلیف نہ کرو۔'' بے اختیار میرے لبوں پہ اپنے ایک ملتانی دوست کی غزل کا مصرعہ آ گیا:

بے خوف ہمیں چھوڑ دے آزاد فضا میں
ہم ایسے پرندے ہیں جو پر ہی نہیں رکھتے

.....

ہنس ہنس کر ڈاکٹر اور ان کی بیگم ایمی کا برا حال ہو گیا۔

میں ابھی ہسپتال میں ہی تھا کہ صفدر ملنے آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ پاکستان جا رہا ہے۔ ''کیا بے نظیر نے بلایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بولا ''شاید یہ اب زندگی بھر ممکن نہ ہو سکے۔ وہ مجھ سے سخت ناراض ہے۔ جن لوگوں نے بھٹو سے بے وفائی کی تھی وہی اس کے اردگرد جمع ہیں۔ اب گھر کو ہی دیکھو۔ اس نے فرینکفرٹ میں کسی بات پر اس سے گستاخی کی تھی تو میں نے بے نظیر کی موجودگی میں اسے ایک زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا تھا۔ وہ ربڑ کی گیند کی طرح لڑھکتا ہوا صوفے پر جا گرا۔ یہ شخص بھٹو کو بیچ منجدھار چھوڑ کر ساز باز ہو کر لندن بھاگ گیا تھا۔ وہ اب وزیر ہے۔ اس قسم کے کاسہ لیسوں، ابن الوقتوں حواریوں، درباریوں کی پوری فوج نے اس کے اردگرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ ہم لوگ بھٹو کی فلاسفی پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے مشن کے لئے جلاوطنی کاٹی جس کا بنیادی نکتہ غریب عوام کی فلاح تھا۔ حکومت اس مشن سے پیچھے ہٹ گئی ہے۔ جب ہم تنقید کرتے ہیں تو ہمیں مطعون کیا جاتا ہے۔ باغی قرار دیا جاتا ہے، ان حالات میں اسے پارٹی کے پرانے خدمت گاروں کی ضرورت ہے اور نہ ہم قرب سلطانی کے متمنی ہیں۔''

''لیکن ناہید خان تو تمہارے بہت قریب تھی۔ تم اس کے محسن ہو۔ ایک طویل عرصہ تک تم نے اس کی میزبانی کی۔ آج کل وہ محترمہ کی نفس ناطقہ ہے وہ غلط فہمی کیوں دور نہیں کراتی؟''

کہنے لگا ''کسی قسم کی کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی نہیں ہے۔ بات اصول کی ہے جس سے میں سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ چاہتا تو میں

بھی جی حضوری کر کے مرکزی وزیر بن جاتا۔ آپ کو تو علم ہی ہے کہ اس نے اپنی کتاب Daughter of the east میں تین بار میرا ذکر کیا ہے۔ باقی رہی ناہید خان کی بات تو اس نے چند نیم دلانہ کوششیں کی ہیں۔''

''تو کیا واپس جا کر علم بغاوت بلند کرو گے؟''

بولا ''ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بھٹو کی بیٹی سے اختلاف تو ہو سکتا ہے۔ بھٹو کی اولاد کی مخالفت نہیں کی جا سکتی۔ میری ماں بیمار ہے۔ رو رو کر اسے ضعف بصارت ہو گیا ہے۔ آپ کو علم نہیں کہ میں نے کتنی بیماریاں پال رکھی ہیں۔ میرا جگر آہستہ آہستہ کام کرنا چھوڑ رہا ہے۔ Slowly but surely I am drifting towards death- جب مرنا ہی ہے تو پھر وطن کی مٹی سے زیادہ اکسیر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے ٹیری لوئیس نے ایک بار پھر میرے سینے پر نشتر رکھا ہو۔ تاسف اور تاریخ یکجا ہونے لگے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اتنی بڑی قربانی اور اس کا یہ صلہ! خاندان برامکہ نے ہارون رشید اور اس کے والد کی مقدور بھر بے لوث خدمت کی تھی۔ انھیں ہمیشہ صراط مستقیم دکھایا تھا۔ اُن کے لیے اپنا سکون اور آرام تج دیا لیکن ذرا سے شک پر انہیں تہہ تیغ کر دیا گیا۔

اقتدار کی اپنی منطق ہوتی ہے اس کا اکثر اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ترحم، قربانی اور وفا وہ فرسودہ اصطلاحیں ہیں جن کا اس اقلیم سے گزر نہیں ہوتا۔ کیا کوئی سردار عبدالرب نشتر کے کرب کا اندازہ لگا سکتا ہے جو اکثر یاس کے عالم میں یہ شعر پڑھتے تھے:

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

.......................................

سردار صاحب نے بھی قائداعظم کی موجودگی میں نہرو کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ شورش کاشمیری کے خیالات سے تو یقیناً اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے وہ الفاظ بھلائے نہیں بھولتے جو اپنی کتاب 'بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل' میں لکھے ہیں۔ لکھتے ہیں ''چودہ اگست کو جب مغنیہ ریڈیو پاکستان سے نغمہ سرا تھی۔ اے قائداعظم تیرا احسان ہے احسان!'' تو ہم لوگ جنھوں نے آزادی کی راہ میں ساری زندگی جیل میں کاٹی تھی یوں منہ چھپا رہے تھے جس طرح ایک بیوہ بھائیوں کے ڈر سے اپنے آنسو چھپاتی ہے۔

## آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا:

واپس پہنچ کر ایک نئی افتاد آن پڑی۔ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک نہیں لٹک گیا۔ واپس پہنچتے ہی پتہ چلا کہ میرا ADCG احمد سعید میری عدم موجودگی میں ڈی سی رحیم یار خان

لگنے کی سر توڑ کوششیں کرتا رہا ہے اور اس سلسلے میں اسے میاں خالق، مسعود اور جعفر اقبال گجر کی اشیر باد حاصل تھی۔ اُس کا موقف یہ تھا کہ ڈی سی عارضہ قلب میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اس کے لئے اب اتنے بڑے ضلعے کو چلانا مشکل ہوگا کیونکہ ڈپٹی کمشنری اہتمام خشک و تر ہی نہیں درد جگر بھی ہے۔ ایک کمزور دل شخص کے لئے تگڑے فیصلے لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس حد تک تو مجھے اچنبھا نہ ہوا۔ سروسز میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ سازش ایک اعتبار سے نوکری کا جزو لاینفک بن گئی ہے۔ صفدر اللہ خان (مرحوم) جب فوت ہوا تو اس کا جنازہ پڑھ کر واپس لوٹتے ہوئے دو افسر آپس میں جھگڑ پڑے۔ ہر ایک کا اصرار تھا کہ متوفی کے GORI میں مکان کا وہ جائز حق دار ہے۔ ایسے آدمی کو ساتھ لے کر چلنا مشکل کام تھا لیکن میں نے مصلحتاً درگزر سے کام لیا۔

اصل مسئلہ کچھ اور تھا۔ میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے تعلقات اس موڑ پر پہنچ چکے تھے جہاں پر ان کے لیے مزید ساتھ چلنا یا ایک دوسرے کو برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ عملاً ایک دوسرے سے بات کرنے کے روادار بھی نہ تھے۔ جمہوریت میں اختلافات کے باوصف ایک فنکشنل ریلیشن شپ ہوتا ہے جس میں ایک دوسرے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں مرکز میں ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے اور صوبوں میں دوسری پارٹی حکمران ہوتی ہے لیکن کاروبار حکومت میں رخنہ نہیں پڑتا۔ ہمارے ہاں ذاتیات کا عنصر کچھ ایسی شدت اختیار کر جاتا ہے جو ان سنہری اصولوں کو پنپنے نہیں دیتا۔ بے نظیر کی لاہور آمد پر میاں صاحب صرف ایک مرتبہ اسے ''ریسیو'' کرنے ایئرپورٹ گئے۔ محترمہ نے گورنر ہاؤس جاتے ہوئے عمداً انھیں اپنی کار میں بٹھا لیا۔ چونکہ پراٹوکول کے تحت گورنر پچھلی سیٹ پر بیٹھتا ہے اس لیے میاں صاحب کو اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ ان دنوں میاں نواز شریف شلوار قمیص کے ساتھ گلے میں سرخ مفلر بھی ڈالتے تھے۔ جیالوں نے مشہور کر دیا کہ بالکل محترمہ کے ڈرائیور لگتے تھے۔ اس پر مسلم لیگیوں نے برا منایا اور یہ طے پایا کہ آئندہ احتیاط برتی جائے چنانچہ جب بھی وہ لاہور آتیں میاں صاحب کاہنہ یا کامونکے کے دورے پر ہوتے۔ محترمہ نے گورنر سجاد قریشی کو کہا وہ میاں صاحب سے وزارت علیہ کا حلف نہ لے۔ سجاد قریشی بڑا زیرک انسان تھا۔ اسے علم تھا کہ اس کے بیٹے شاہ محمود کو صرف میاں نواز شریف ہی وزارت دے سکتا ہے چنانچہ اس نے نہ صرف پہلی فرصت میں ان سے حلف لیا بلکہ میاں صاحب کو وزیراعظم کے ''افکار عالیہ'' سے بھی آگاہ کر دیا۔ اس چپقلش کو ہوا دینے میں ان طاقتوں کا بھی ہاتھ تھا جنھیں آج کل

اسٹیبلشمنٹ کہا جاتا ہے۔

**تحریک عدم اعتماد:** میاں صاحب نے بڑی سوچ بچار کے بعد وزیراعظم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا پلان بنایا۔ جس میں غلام مصطفیٰ جتوئی، اکبر بگٹی اور کچھ سندھی لیڈروں نے بھی حصہ لیا۔ سکیم یہ بنی کہ بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لائی جائے اور جمہوری طریقے سے اسے فارغ کر دیا جائے۔ اس کی جگہ غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزیراعظم بنانے پر بھی سب کا اتفاق ہو گیا۔ خفیہ طور پر پیپلز پارٹی کے ''نرم'' ممبران سے بھی رابطہ کیا گیا۔ خزانوں کے منہ کھل گئے۔ ممتاز جوئیہ کا بیان ہے کہ وہ اس وقت حیران رہ گیا جب ننکانے کے ممبر اسمبلی نے پچاس لاکھ روپے کا بریف کیس بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُٹھا لیا۔ جوئیہ اس وقت ڈی سی شیخوپورہ تھا۔ اس سلسلے میں پنجاب کی بیوروکریسی کی خدمات سے بھی پورا استفادہ کیا گیا۔ اکثریت کو کئی بار گنا گیا اور جب اس امر کی تسلی ہو گئی کہ ''نگ'' پورے ہیں تو تحریک عدم اعتماد لائی گئی۔ یہ ساری پلاننگ اتنی خفیہ ہوئی کہ محترمہ کو آخری وقت تک پتہ نہ چل سکا کہ انہیں رخصت کرنے کی سکیم بن چکی ہے لیکن جب ایک دفعہ بلی تھیلے سے باہر آ گئی تو ان کے غصے اور غیض و غضب کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے وارننگ دی کہ ملک میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے اور وہ کسی صورت باغی ممبران کو اسمبلی میں قدم نہ رکھنے دیں گی۔

میاں صاحبان کی پلاننگ تو پرفیکٹ تھی لیکن ان سے ایک بنیادی غلطی ہو گئی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ان سب ممبروں کو ڈیرہ بگٹی میں رکھا جاتا جہاں کوئی فیڈرل ایجنٹ پر بھی نہ مار سکتا اور آخری دن کوچوں میں بٹھا کر مسلح بلوچ جوانوں کی نگرانی میں اسمبلی لایا جاتا۔ پتہ نہیں مری میں رکھنے کی تجویز کس نے دی؟ اور مال روڈ پر گھومنے پھرنے کی آزادی دے دی گئی۔ کسی یوسف رضا ٹائپ مشیر نے محترمہ کو مشورہ دیا کہ مرنے مارنے کی بات نہ کریں، شکار کو جال میں پھنسانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ ادھر سے بھی خزانوں کے گیٹ کھل گئے۔ بکاؤ مال ہمیشہ ادھر جاتا ہے جہاں دام زیادہ ملیں۔ فیڈرل گورنمنٹ نرخ بالا کن کے مصداق قیمتوں کو آسمان پر لے گئی۔ ایم این اے ایک ایک کر کے گندم کے دانوں کی طرح کرنے لگے۔ پنجاب چونکہ غیر محفوظ علاقہ تھا اس لیے گھوڑوں کو پہلے پشاور لے جایا گیا اور پھر سوات کے اصطبل میں بند کر دیا گیا۔ ٹیلی فون کے سب کنکشن کاٹ دیئے گئے۔ ان دنوں موبائیل فون نہیں تھے اگر ہوتے بھی تو انہیں بجق سرکار ضبط

کرلیا جاتا۔
میاں صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ پیپلز پارٹی کے بھگوڑوں کو نہ صرف راسیں ڈال دی گئی بلکہ کچھ مسلم لیگی ممبران بھی حرص و آز کے سمندر میں کود گئے۔ گویا نقصانِ مایہ اور شماتت ہمسایہ یکجا ہو گئیں۔ مسلم لیگ سے جو ممبر بھاگے تھے ان میں بدقسمتی سے رئیس شبیر اور احمد عالم انور بھی شامل تھے۔ رئیس شبیر انتہائی چالاک، مطلب پرست اور خود غرض انسان ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت تسبیح رکھتا ہے۔ بات کی ہر تان بھی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر ٹوٹتی ہے لیکن اس سفید رنگ کے انسان کے سینے میں ایک سیاہ دل ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو میرے گھٹنے پکڑ کر کہتا تھا کہ میں سادات کا غلام ہوں، میری نواز شریف سے ملاقات کرا دیں۔ الیکشن میں اس کا اور احمد محمود کا مشترکہ لنگر تھا جب اس نے پیسے مانگے تو یہ ایک مرتبہ پھر میرے پاس آ کر گڑگڑانے لگا۔ میں نے احمد کو سمجھایا کہ کنجوس شخص چمڑی تو دے سکتا ہے دمڑی کا روادار نہیں ہوتا۔ سمجھ لو کہ تم نے اس کے حصے کی رقم اس کو دان کر دی ہے۔ اس آپریشن گیٹ بے نظیر میں جتنے ہاتھ اس شخص نے رنگے شاید ہی کسی اور نے اتنا بڑا ہاتھ مارا ہو۔ اپنی فصلوں کی تباہی کی بے بنیاد اور جھوٹی خبریں سنا کر کروڑوں روپے ہتھیا لئے۔ اس کے علاوہ پی آئی اے کی جی ایس اے بھی حاصل کی جس کو اس کا بینا رئیس منیر چلاتا تھا۔
احمد عالم انور وزارت کے وعدے پر ہی رام ہو گیا۔ یہ محترمہ کی شخصیت سے ویسے بھی بہت متاثر تھا اور انہیں ہمیشہ ہمشیرہ کہہ کر بلاتا تھا۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن تو لڑا تھا لیکن میاں نواز شریف سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ جذبات جنھیں اس نے ایک عرصہ تک دبائے رکھا تھا اب کھل کر سامنے آ گئے۔
رئیس شبیر کے ڈانواڈول ہونے کی خبر میاں صاحب تک پہنچی تو وہ دیگر پارٹی رہنماؤں کو لے کر اسلام آباد میں اس کے گھر پہنچ گئے۔ رئیس نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا، نوکر کو چائے پانی لانے کا کہا۔ پیشتر اس کے کہ میاں صاحب استفسار کرتے۔ کہنے لگا "مجھے بڑے زور سے پیشاب لگا ہے چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔ وہ غسل خانے میں گیا اور اس کا عقبی دروازہ کھول کر بے نظیر کے پاس بھاگ گیا۔ اپنی قیمت بڑھانے کا یہ اچھوتا طریقہ تھا۔ سارے مسلم لیگی اس کے گھر سے بے نیلِ مرام لوٹے۔"

[جاری ہے۔]

## پاکستانی غزل 2010 کے بعد

### میں وہاں ہوں ہی نہیں، لوگ جہاں دیکھتے ہیں

شاعرِ امروز

# نادیہ گیلانی

### شاہد ماکلی

نادیہ گیلانی نے بہت کم عرصے میں اپنی شعری شناخت مستحکم کی ہے۔ ان کے لہجے کی بے باکی اور لَو دیتی ہوئی اداسی کی متنوع کیفیات کسی شعلۂ مستعجل کی طرح نہیں ہیں بلکہ یہ عناصر ایک مستقل تخلیقی جوہر کے طور پر ان کی شعری تشکیلیت میں کارفرما ہیں۔ وہ بدلتے ہوئے منظرنامے کی تفہیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حیرت (اور اندوہ) کو نہ صرف بینت بینت کے رکھتی ہیں بلکہ اسے قلب و نظر کا حصہ بنا کر اپنے تخلیقی عمل میں کھپا دینے پہ بھی قدرت رکھتی ہیں۔ شدید مصائب اور اضطراب و اضطرار کے اعصاب شکن لمحوں میں ایک در اور ایک گھرانے کی طرف دیکھتی ہیں؛ اپنی حالتِ زار بیان کرتی ہیں؛ گریہ وزاری میں دعا کو ہاتھ اٹھاتی ہیں اور بالآخر تسکین پاتی ہیں۔ ان کے حمدیہ، نعتیہ اور سلام کے اشعار میں ان کے قلبی و روحانی اضطراب کی کیفیات حد درجہ دل گداز اور رقت آمیز ہیں۔



نادیہ گیلانی 7 جون 1992 کو بغداد میں پیدا ہوئیں۔ لاہور میں مقیم ہیں۔ اپنا کلینک چلاتی ہیں اور ساتھ ساتھ کنسٹرکشن کے کام سے منسلک ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصر سا شعری انتخاب:

حضور میرے خالی پن کا کچھ علاج کیجیے
جو رنگ ہے مکان پہ، مکیں پہ لگ نہیں رہا

حضور رحم کیجیے ، بلا ہی لیجیے مجھے
کئی دنوں سے دل مرا کہیں بھی لگ نہیں رہا

یہ بے دلی ہے، یہاں کیفیت نہیں ہو گی
خلا میں کوئی بھی موسم اثر نہیں کرتا

یہ ارتقا ہے محبت کا ، حادثہ نہ سمجھ
تمام لوگ جو پھرتے ہیں باقیات لیے

یہ روز روز کا ہنسنا مجھے نگل جاتا
خدا کا شکر کہ شامیں اداس ہونے لگیں

میں اگر خوش ہوں تو لگتا ہے، پرندے خوش ہیں
دل کی سرشاری فضاؤں پہ اثر کرتی ہے

نعمتیں شکر نہ کرنے سے پلٹ جاتی ہیں
میرے مولا مجھے ہر حال میں شاکر رکھنا

قفس کا بوجھ پرندے کی سانس روکتا ہے
تمہاری یاد خلل ڈالتی ہے کاموں میں

یہ عشق ہے سو یہاں بادشہ نہیں چلتے
ادھر قطار میں بیٹھو، وہاں غلاموں میں

عادت اکیلے پن کی، جو پہلے عذاب تھی
اب لطف بن گئی ہے، اذیت نہیں رہی

ہمارا ہنسنا اذیت نہیں لگے گا انہیں
قفس پرندوں کی مشکل نہیں سمجھ سکتے

کیسے پاگل ہیں یہ اُس سمت کہاں دیکھتے ہیں
میں وہاں ہوں ہی نہیں، لوگ جہاں دیکھتے ہیں

تیرا شانہ اُسے میسّر ہے
کتنی خوش بخت ہے رقیب مری

ہمیں کسی سے شکایت نہ کوئی شکوہ ہے
سبھی کی خیر! سبھی کا بھلا کرے مولا

اسے رونے سے مت روکو، وہ بندہ
پسندیدہ محبت کھو چکا ہے

اپنا چپ چپ رہنا، دریا کا میدان میں آنا ہے
جب بھی وسعت بڑھ جائے تو خاموشی چھا جاتی ہے

اس تسلی کا شکریہ لیکن
میرے دل میں بہت اداسی ہے

ایک وحشت ہے کہ ہر عکس میں آ جاتی ہے
جانے کیا رنج ہے جو آنکھ سے جاتا ہی نہیں

ایک شہکار غزل ہے جو ابھی رہتی ہے
یعنی اک آخری خط ہے جو اسے لکھنا ہے

یہ بھی اک ذہنی اذیت ہے، مسافر کو اگر
گھر پہنچ کر بھی یہ لگتا ہے کہ گھر جانا ہے

اتنی شدت سے کسی اور پہ کیسے مرتے
اتنی ہمت بھی بھلا اور کہاں سے آتی

جانے کب ان کی اذیت میں کمی لائے خدا
ہم جو ہنستے ہیں تو کچھ لوگ بہت روتے ہیں

تو ہی جب چھت نہ بنا، کیسے مَیں گھر ہو جاتی
زندگی نظم نہیں تھی کہ امر ہو جاتی

حادثے کی خبر پہ غور کرو
عین ممکن ہے یہ ہماری ہو

میں اداسی میں رو نہیں سکتی
میری اس کیفیت کا دکھ سمجھو

میرے آنسو تھے اس کے سینے پر
باپ کی قبر پر کھڑی تھی میں

☆☆☆☆☆

پاکستانی غزل 2010_ کے_ بعد

## ہر قدم بڑھتا تجسس ہے کہ اب کیا ہوگا



### شاعرِ امروز
## مُقیل بخاری

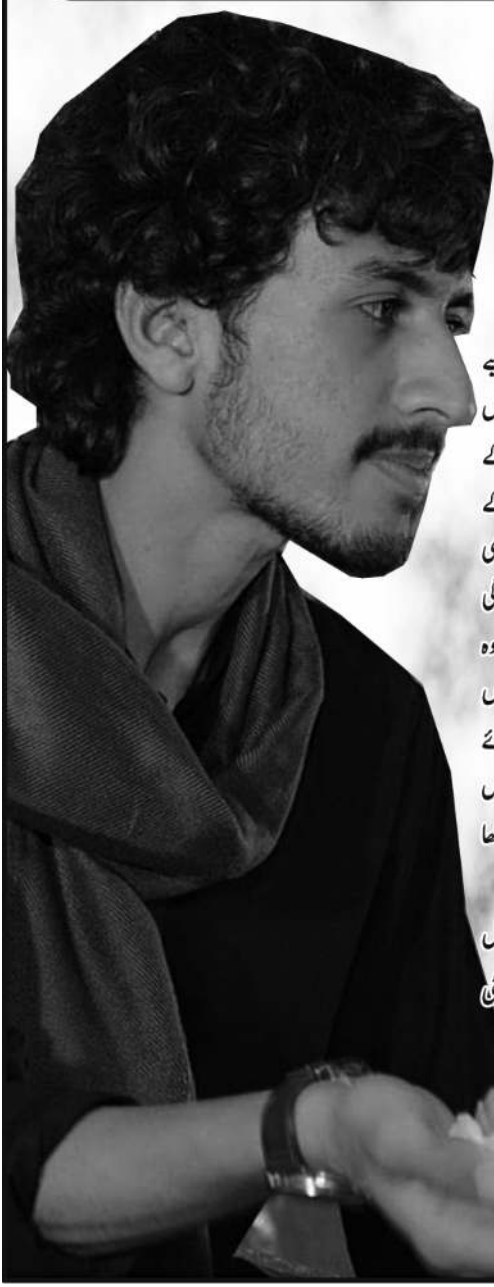

### شاہد ماکلی

اگرچہ مُقیل بخاری کو اپنا شعری سفر آغاز کیے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر ان کی غزلوں میں ایسے اشارے ضرور ملتے ہیں جو ان کے پوشیدہ امکانات کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے ہاں پامال راستوں سے انحراف کی کوشش بھی ملتی ہے اور روایت کے کچھ عناصر سے تازگی کشید کرنے کا رجحان بھی موجود ہے۔ وہ معاصر منظرنامے کے جدید حسیاتی تقاضوں سے آگاہ ہیں۔ وہ نئے معنی اور نئے پیرائے کے کھوجی ہیں۔ نئی حسیت دانی کا انعکاس ان کی غزل میں اسلوبی سطح پر بھی دیکھا جاسکتا ہے اور موضوعی سطح پر بھی۔

مقیل بخاری 18 اگست 1999 کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں زیرِ تعلیم ہیں۔ وہاں کے

ادبی مجلّہ کشتِ نو کے مدیر اور ڈیبیٹنگ کلب کے ہونہار مقرّر ہیں۔2020 سے لکھنا آغاز کیا۔ ذیل میں ان کے چند منتخب اشعار:

کہیں ایسا نہ ہو، تم جو بھی بولو، سر سے گزرے
مرے قد سے تمھارا شور اونچا ہو رہا ہے

تم اتنی بے حسی میں مبتلا ہو دوست !
میں روؤں تو لگے گا قہقہہ تمھیں

کام آسان تو نہیں لیکن
اس کو ہنس کر دکھا رہا ہوں میں

ایک وعدے کی یہ تلافی ہے
سارے وعدے نبھا رہا ہوں میں

کہاں جانا ہے، کہاں اگلا قدم رکھنا ہے
دھند اتنی ہے کہ رستہ نہیں دیکھا جاتا

مجھے یہ علم نہیں ہے کہ کیا کروں گا میں
مگر کروں گا تو سب سے جدا کروں گا میں

سو نئے زاویے کھلتے ہیں سفر میں مجھ پر
ہر قدم بڑھتا تجسس ہے کہ اب کیا ہو گا

کروں گا میں ترا دیدار اک دریچے سے
پھر اس کے بعد خدا جانے کیا کروں گا میں

تمھارا نام کسی کو نہیں بتاتے ہم
بس اک نشان جبیں سے نہیں مٹاتے ہم

میں ہر بلا کو ہنس کے گلے سے لگاتا تھا
پھر تُو بھی آ گیا تو کنارہ نہیں کیا

یہ باغ عشق مرا دائمی ٹھکانہ ہے
اجل کے بعد بھی مجھ کو یہیں پہ آنا ہے

میں روشنی ہوں سو مجھ کو سفر میں رہنا ہے
جو ہیں سفر میں، اُنھیں راستہ دکھانا ہے

ہمارا کام ہے شاخوں سے خاک پر گرنا
تمہارا کام اسی خاک کو اڑانا ہے

میں جب سمندروں سے ملا، تب کی بات ہے
آنکھوں میں لہر، بات میں گہرائی آئی تھی

جانے سے اس کے، باغ میں سب کچھ بدل گیا
آنے سے جس کے باغ میں رعنائی آئی تھی

☆☆☆☆☆

# غزل

اُڑتی تتلی میں ڈھل جائیں
رنگ کِسی کے ہاتھ نہ آئیں

لوہے کا دِل رکھنے والے
لوہے کا پانی پی جائیں

پَل پَل ٹوحوں کی شہنائی
پَل پَل آنکھیں بھَر بھَر آئیں

ہاتھ لہُو میں تَر رہتے ہیں
بان بٹیں یا بان چلائیں

یار گدائی کو نکلے ہیں
ہاتھ کا برتن بیچ نہ آئیں

بین ہیں یہ بینائی کے خالد
منظر آنکھ میں اُترے جائیں

خالد احمد

# غزل

رکھتے ہیں مری فکر میں کردار پرندے
خوابوں میں چلے آتے ہیں دلدار پرندے

کچھ پیڑ مرے صحن میں پھل والے کھڑے ہیں
کھاتے ہیں یہاں شوق سے اثمار پرندے

خوش رنگ منڈیریں ہیں یہاں ان کے پروں سے
ارژنگ بنا دیتے ہیں دیوار پرندے

ہر سمت ہیں بکھری ہوئی نغمات کی موجیں
گاتے ہیں کبھی آر کبھی پار پرندے

ہر لحظہ سکھاتے ہیں رفاقت کے قرینے
الفت کو وسیلہ کریں ہر ڈار، پرندے

پھولوں کی قطاروں کی طرح شاخ نشیں ہیں
ہر پیڑ کی چوٹی کی ہیں دستار پرندے

میرے لیے ہیں حرف سکوں وجہِ تسلی
ہر غم میں طرف دار ہیں غم خوار پرندے

دل اُن کی طرف بن میں کھنچا جاتا ہے اپنا
رکھتے ہیں محبت بھری چہکار پرندے

بھولی ہوئی یادوں کی خبر اُن سے ہے ثابت
گم کردہ حسینوں کے ہیں دیدار پرندے

آصف ثاقب

# غزل

زندہ رُود زمانہ ہے
باقی سب افسانہ ہے

ہوتا تھا یہ باغ مرا
اب تو سب ویرانہ ہے

دنیا ہے ، مہمان سرا
یعنی سب کو جانا ہے

کیسی بھیڑ ہے اپنوں کی
ہر کوئی بیگانہ ہے

بدلیں گے نہ رات اور دن
اچھا وقت بھی آنا ہے

ہر بازی ہے نئی نئی
پھر بھی کھیل پرانا ہے

رات ابھی کچھ باقی ہے
آ جاؤ جو آنا ہے

دونوں کی ہے منزل ایک
شمع یا پروانہ ہے

جیون کی اس گھڑی کا
سب نے بوجھ اُٹھانا ہے

عشق مسافت میں امجد
کھو جانا ہی پانا ہے

امجد اسلام امجد

# غزل

کہی نہ جائے اُسے بات لب پہ آئی بھی
بڑا حجاب ہے یہ رسمِ آشنائی بھی

مِلے نہ تُو تو کسی اور سے بھی میں نہ مِلوں
مجھے عزیز بہت ہے تری جُدائی بھی

کُھلا اِک اور قفس میں قفس کا دروازہ
اِک اور قید کی تمہید تھی رہائی بھی

گُناہ سے بھی گُریزاں رہا دلِ ترساں
پہنچ سے دُور تھی اِقلیمِ پارسائی بھی

گھٹا سمجھتی تھی رمزِ حیات کو انور
اِسی لئے تو وہ روئی بھی مسکرائی بھی

انور مسعود

---

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

صبحِ عروج کی راہ نہ تکنا، شامِ زوال نہ کرنا
عشق سفر کرنا، لیکن سورج کی چال نہ کرنا

# غزل

جلیل عالی

بھلے تن سے لہو کا ایک اک قطرہ نکل جائے
نہیں ممکن کہ شرحِ خواب کا سودا نکل جائے

بھرا بیٹھا ہوں اک مدت سے دیکھو مجھ کو مت چھیڑو
فشارِ درد میں منہ سے نہ کچھ ایسا نکل جائے

سروں پر روز اک تازہ قیامت ٹوٹتی ہو تو
عجب کیا جو دلوں سے حشر کا دھڑکا نکل جائے

یہ ممکن ہے کہ خالی ڈھیر ہی رہ جائے لفظوں کا
کہانی سے اگر اک مختصر خاکہ نکل جائے

ہنر جس میں بھی ہو تسلیم کرتا ہوں سرِ محفل
کہ دل سے تنگیِ احساس کا کانٹا نکل جائے

ابھی موجود کچھ محفوظ دروازے ہیں، کل جانے
کدھر کن گھاٹیوں کو آخری رستا نکل جائے

مرے اظہار کی رفتار کا کر اِس سے اندازہ
ذرا سی بات کہنے میں بھی دن سارا نکل جائے

# غزل

میں جاؤں تو کیا کہنا، وہ آئیں تو کیا کہنا
دو چار ملاقاتیں ہو جائیں تو کیا کہنا

رکھتے ہیں، بنا کر وہ گھبرا کے رقیبوں سے
ہم سے نہیں گھبراتے، گھبرائیں تو کیا کہنا

شیخ اپنی طبیعت سے جاتے نہیں میخانے
احباب انھیں لے جا کر پلوائیں تو کیا کہنا

تنقید کرو تو وہ ہوتے ہیں خفا ہم سے
البتہ اگر اُن کے گُن گائیں تو کیا کہنا

ہر بات پہ اَڑتے ہیں سمجھاؤ تو لڑتے ہیں
اِس خو پہ شعور اپنی شرمائیں تو کیا کہنا

انور شعور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہنستے ہنستے کہہ جاتے ہو، تم بھی ساری باتیں
میرے وار پہ اپنے آگے میری ڈھال نہ کرنا

# غزل

ہمارے گھر کے مضافات ہیں ستائے ہوئے
کہ منچلوں نے ہیں میلے یہاں لگائے ہوئے

خطیبِ عصر نے مٹھی میں لے لیا سب کو
بڑے سناتا ہے فقرے رٹے رٹائے ہوئے

زبانِ طعن کو تو چاند یہ چڑھانا تھا
کہ جو بھی اپنے تھے سارے وہی پرائے ہوئے

دلِ خراب پہ تاریکیاں ہیں سایہ فگن
نقوش چہرہ ہیں لیکن سجے سجائے ہوئے

قیامتوں کا تھا منظر شبابِ دریا میں
کہ ڈوب ڈوب گئے گھر بنے بنائے ہوئے

کھلی فضاؤں میں اڑتے ہوئے پرندوں کو
نہ جانے تیر کیوں ماریں کسے کسائے ہوئے

بھکاریوں کی بھی قسمت نے یاوری کی ہے
نوالے ان کو ملے ہیں بچے بچائے ہوئے

نئے لگانے کے حرص آزما بہانوں سے
شجر گرائے گئے ہیں لگے لگائے ہوئے

ریاضؔ آج وہی ہے غزل پسندیدہ
کہ شعر جس کے ہیں کب سے سنے سنائے ہوئے

سید ریاض حسین زیدی

# غزل

زہر پیالہ پی سکتے ہیں
ایسے بھی ہم جی سکتے ہیں

کب تک ضبط کریں ہم آخر!
کب تک آنسو پی سکتے ہیں

اَور ہمارے بس میں کیا ہے؟
ہم تو بس رو ہی سکتے ہیں!

اپنا دامن چاک بھی رکھ کر
تیرا دامن سی سکتے ہیں

جس سے ہم ناراض ہیں اتنے
اس کی طرف جا بھی سکتے ہیں

چاک جگر کو کون سئے گا
دامن کو تو سی سکتے ہیں

جینا اِتنا مشکل ہے تو
اِک دن ہم مر بھی سکتے ہیں

نسیمِ سحر

# غزلیں

ہماری ہی گزارش کا کوئی مقصد نہیں ہوتا
عدو کا تو سوالِ بوسہ تک بھی رَد نہیں ہوتا

یہ تم جو پاس آ بیٹھے ہو، دردِ دل کی مت پوچھو
اگرچہ اَب بھی ہوتا ہے مگر بے حد نہیں ہوتا

سبھی کو مِل نہیں جاتا کوئی تحفہ محبت میں
ہر اِک انسان مر کر صاحبِ مرقد نہیں ہوتا

نمازِ شوق میں سجدہ سے جب مَیں سر اُٹھاتا ہُوں
کبھی محراب غائب اور کبھی گنبد نہیں ہوتا

درختوں میں بھی اِنسانی رُوپے پائے جاتے ہیں
شجر ہوتے ہُوئے بھی ہر کوئی برگد نہیں ہوتا

## خاور اعجاز

حروف کب کے، بیاں کب کا اور زباں کب کی
سُنا رہے ہو میاں تم یہ داستاں کب کی

یہ اپنی خاکِ انا ہے جو اُڑتی پھرتی ہے
وگرنہ بیٹھ چکی گردِ کارواں کب کی

گذر رہی ہے اُمیدِ بہار پر ورنہ
پڑی ہے زرد مری شاخِ آشیاں کب کی

اُسی کی چشمِ فسوں ساز کو خبر ہو گی
رُکی ہُوئی ہے کہاں گردشِ جہاں کب کی

خبر تو رکھتے ہیں خاورؔ مگر نہیں معلوم
کسر نکالتا ہے کب یہ آسماں کب کی

# غزل

صفدر صدیق رضی

اس نے اقرارِ صداقت کی علمداری کی
رسم انکار کی جس شخص نے بھی جاری کی

کوئی جابر کوئی مجبور نہیں دنیا میں
حدِّ فاصل ہے یہ مجبوری و مختاری کی

زندگی ایسی بھی نایاب و گراں کب تھی مگر
ہم نے قیمت جو ادا کی ہے بہت بھاری کی

روشنی کو نہیں پہچان سکے شب زدگاں
جب کہیں دیپ جلا اور بڑھی تاریکی

ایک ہی جرم کہ سرزد ہوا نادانی میں
ہم نے اک شخص کو دل دے کے دل آزاری کی

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کب وہ اسے پسند تھے، پیڑ کہ سر بلند تھے
جڑ سے وہ سب اکھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

# غزل

جس نے تنہا سب کو پالا، اُسے سنبھال نہیں سکتے
سارے بیٹے مل کے بھی اک باپ کو پال نہیں سکتے

برسوں پر پھیلی اِس زرد رفاقت سے کیا لینا ہے
جب ہم اپنے آپ کو اک دُوجے میں ڈھال نہیں سکتے

ہم نے جن کو ووٹ دیے، اُن سے بھی بڑے مجرم ہیں ہم
اپنی ذمہ داری دوسرے شخص پہ ڈال نہیں سکتے

ڈھونڈ کے لاؤ اپنے اُفق کے سورج، چاند، ستاروں کو
تم یہ بستی دیے جلا کر کبھی اُجال نہیں سکتے

تم نے خود ہی راہزنوں کو راہنما تسلیم کیا
فطرت کا قانون ہے، اب ہونی کو ٹال نہیں سکتے

تم ناحق ناراض ہو ہم سے، سچ تو یہ ہے جانِ انیس!
ہم وہ لوگ ہیں، اپنے لیے بھی وقت نکال نہیں سکتے

محمد انیس انصاری

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جھلمل جھیل میں گھول نہ دینا، یہ مٹی کی مٹھی
دیکھنا بابِ شوق میں شاملِ سطرِ ملال نہ کرنا

# غزلیں

ایک تصویر بھی، اک پھول بھی سامان میں ہے
وہ جو بچھڑا ہے ابھی تک مرے امکان میں ہے

اک طرف کھلتی سیاہی بھی شفق رنگوں میں
اک طرف ڈوبتی پرچھائیں مرے دھیان میں ہے

خشک کانٹا بھی نہیں ہوتا، بکھرتا بھی نہیں
ایک کیکٹس جو ترے ہجر کا گلدان میں ہے

سبز دھجی میں بندھے خواب بھی ہیں تھوڑے سے
ریت بھی اڑتی ہوئی ساعتِ ویران میں ہے

اک افق کھینچ کے لے جاتا ہوا اپنی طرف
اور مری ایڑی کہ دنیا کے خیابان میں ہے

آنکھ پھر ڈھونڈ کے لے آتی ہے منظر کتنے
بات دل کی ہے جو پہلے سے ہی نقصان میں ہے

جسم کی پیاس بڑھاتی ہوئی سلوٹ طاہرؔ
میں نہیں ہوں مرا بستر کسی ہیجان میں ہے

## قیوم طاہر

فراق لکھا ہوا گیٹ پر دکھائی دے
بجی ہے کوچ کی سیٹی، سفر سنائی دے

مرے چراغ مرے ساتھ بات کرتے رہو
مجھے تو لمسِ ہوا کچھ الگ بجھائی دے

وہ قحطِ صوت پڑا ہے دبا کی بستی میں
یہاں کسی کی، نہ اپنی کوئی دہائی دے

لویں سنبھالتے، میں ہاتھ بھی جلا بیٹھا
چراغِ جاں کو دریچہ کبھی رہائی دے

زمین جتنی مرے پاؤں میں ہے وہ تو رہے
تُو میرے حصے کی اتنی مجھے خدائی دے

اُسے کہو کہ ہنسی اپنی گھول دے طاہرؔ
مرے لبوں کے وہ کاغذ کو روشنائی دے

# غزل

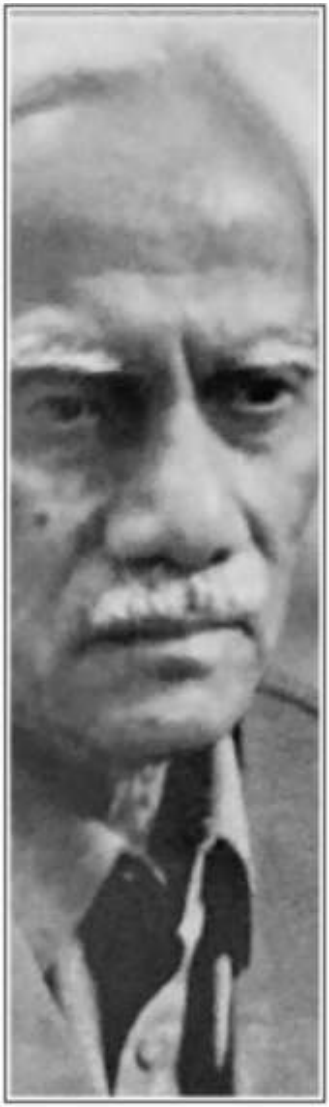

محسن اسرار

رات گزری ہے ایک پیار کی رات
اس کے بھرپور انتظار کی رات

کیا مسافت تھی، کیا مسافر تھا
تھی سواری کی اور سوار کی رات

وقت کے ساتھ خوب کھیلی تھی
چند لمحوں پہ انحصار کی رات

کھل گئے تھے مفر کے در کتنے
کیا عجب تھی مرے فرار کی رات

مجھ میں گم ہیں اڑی ہوئی نیندیں
میں ہوں درویش کے مزار کی رات

اے مرے خواب! اختیار میں رہ
مجھ پہ طاری ہے اعتبار کی رات

ناؤ میں چھید کر رہی ہے مری
ایک دریا کے آر پار کی رات

رات وہ مسکرائی جب تو کھلا
کیسی ہوتی ہے اختیار کی رات

جیسے وہ کال کر رہی ہو مجھے
ہے یہ اعداد اور شمار کی رات

سو رہی ہے مری جگہ محسن
میرے بستر پہ بے قرار کی رات

# غزل

کر دیا جاتا تھا پہلے جہاں خاموش مجھے
لوگ اب سنتے ہیں ہو کر ہمہ تن گوش مجھے

دکھ ہی ایسے تھے کہ آنے نہ دیے ہوش مجھے
دیکھنے والے سمجھتے رہے مے نوش مجھے

جانے کیوں رات مجھے دن سے حسیں لگتی ہے
اچھی لگتی ہیں حسینائیں سیہ پوش مجھے

میں ابل کر نہ بجھا دوں کہیں اپنا چولھا
اپنے ہاتھوں ہی نہ مروا دے مرا جوش مجھے

کتنے الزام لگائے گئے لیکن تھا یقیں
وقت خود کر دے گا ثابت کبھی نردوش مجھے

جیت کر اس کو دکھانا پڑا کچھوے کی طرح
سست رفتار سمجھتا تھا جو خرگوش مجھے

یاد آئی تو رگ و پے میں کھلے سرخ گلاب
رات جب اس کی مہکتی ہوئی آغوش مجھے

جن پہ اشعار کا احسان کیا ہے راحت
جیتے جی کر نہیں سکتے وہ فراموش مجھے

تنگ حاسد کی نظر سے بھی ہو راحت جو گھر
رکھتے دیکھو گے نہ اس میں کبھی پاپوش مجھے

راحت سرحدی

# غزل

شہر کی خامشی بتائے گی
کیا ہُوا زندگی بتائے گی

خوشبوؤں نے کہاں اُترنا ہے
باغ کی سرخوشی بتائے گی

تم ارادہ کرو نکلنے کا
راستہ چاندنی بتائے گی

کب ستارہ فلک پہ اُبھرے گا
رات کی ہمسری بتائے گی

کیسے ٹوٹا ہے جام ساقی سے
راز یہ تشنگی بتائے گی

وقت کتنے سوال کرتا ہے
زیست کی آگہی بتائے گی

وقت رکھتا ہے آبرو کس کی
یہ گزرتی گھڑی بتائے گی

موج رہتی ہے کس تعاقب میں
گنگناتی ندی بتائے گی

**شار ترابی**

# غزلیں

کیا علاقہ ہے انھیں گوہر و الماس کے ساتھ
ذہن و دل میں جو اُتر جاتے ہیں احساس کے ساتھ

پھر وہی ابر کے ٹکڑے ہیں ابابیلیں ہیں
پھر مجھے باندھ دیا اُس نے کسی آس کے ساتھ

میں ادھیڑا کروں جلد اپنی کریدا کروں زخم
اس نے ناخن بھی جڑے کیسے مرے ماس کے ساتھ

اس کے ایمان کی تجدید ضروری ہے میاں
علی اصغرؓ نہ جسے یاد رہے پیاس کے ساتھ

اب تو اتنی نہیں فرصت کہ ہوا کھا آئیں
تھا محبت کو علاقہ کبھی بن باس کے ساتھ

صبح کی دھوپ میں بھیگے ہوئے خوش کن لمحے
گل لالہ بھی مقابل تھا امل تاس کے ساتھ

رات بھر اونچی ہواؤں میں رہا اور دم صبح
مثل شبنم ہوا پامال ہری گھاس کے ساتھ

## سعد اللہ شاہ

بہہ نہ پایا میں جب بہاؤ کے ساتھ
مجھ کو جلنا پڑا الاؤ کے ساتھ

خود ہی قدموں میں آن پڑتا ہے
دل نہیں ملتا بھاؤ تاؤ کے ساتھ

جب بھی جذبوں سے جی مہکتا ہے
شعر ہوتا ہے تب رچاؤ کے ساتھ

پانیوں کا سفر ہے آنکھوں کو
دل بھی ٹوٹا ہے ٹوٹی تاؤ کے ساتھ

کیا بتاؤں کہ زخم کس نے دیا
مسکراتا رہا میں گھاؤ کے ساتھ

شہر میں آ گیا تھا گھر میرا
میں سڑک پر تھا پھر کٹاؤ کے ساتھ

سیر کے بات سمجھو ختم ہوئے
زندگی اب تلے گی پاؤ کے ساتھ

سعد آساں نہیں تھا جینا یہاں
ہم بھی پتھر ہوئے دباؤ کے ساتھ

# غزل

اک شہرِ رنگ و نور اجڑنے کا دکھ بھی تھا
شاخِ نظر سے خواب کے جھڑنے کا دکھ بھی تھا

رنگوں سے اَٹ گیا تھا ہتھیلی کا آسماں
پَر دل میں تتلیوں کو پکڑنے کا دکھ بھی تھا

کچھ تو شکستِ آئنہ ، وجہِ ملال تھی
کچھ اپنے خدّ و خال بگڑنے کا دکھ بھی تھا

سینے میں ایک حبس اُترنے کی دیر تھی
پھر آندھیوں کے زور پکڑنے کا دکھ بھی تھا

حامد، کسی پُرانے شجر کی طرح ، ہمیں
دھرتی سے اپنے پاؤں اکھڑنے کا دکھ بھی تھا

**حامد یزدانی**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

ہر سو تھے ، ہی غبار فرما
تو تھا کہ ہوا کا قہقہہ تھا

# غزل

سرا خراب نہ ہو ، ہم سرا خراب نہ ہو
یہ شغلِ شب ہے مرا اور ذرا خراب نہ ہو

اِدھر جو آتا ہے اُس کو میں آنے دیتا نہیں
کہ تیرا چھوڑا ہوا راستہ خراب نہ ہو

تمھارا اور مرا کھیل جانے کیا ہے مگر
تمھارا اور مرا کھیلنا خراب نہ ہو

ہنسا میں لوحِ جہاں کو وصول کرتے ہوئے
خراب دے کے وہ کہنے لگا ، ''خراب نہ ہو''

سویرے دیکھ لیا کر تو اپنی آنکھوں کو
کہ سارے دن کا ترا دیکھنا خراب نہ ہو

میں تم سے کی ہوئی باتیں دوبارہ کرتا نہیں
وہ اِس لیے بھی کہ میرا مزہ خراب نہ ہو

تمھارے چاہنے والوں پہ کیا جچا ہے یہ رنگ
اڑے تو اڑتا رہے اور ذرا خراب نہ ہو

شاہین عباس

# غزل

تیری زلفیں سنوارتی شامیں
کتنی پیاری ہیں ملگجی شامیں

اپنے لہجے گداز رکھتی ہیں
آپ کی طرح سوچتی شامیں

لیے جاتی ہیں مجھ کو بھی ہمراہ
آپ کی راہ دیکھتی شامیں

تیرے معیار سے بہت کم ہیں
رنگ خوشبوئیں شاعری شامیں

دل کے شاعر کی ہے مرے خواہش
آبجو ، آپ ، بانسری ، شامیں

ایک پل میں گزر گئیں کیسے
زندگی کو محیط سی شامیں

بزم سے کون اٹھ گیا ثاقب
زیست سے ہیں تہی تہی شامیں

منظور ثاقب

# غزل

جب اُن کے ساتھ کبھی ہم کلام ہوتے تھے
تو قُرب و مستی کے کیا اژدہام ہوتے تھے

مدام نشۂ صہبائے قُرب رہتا تھا
حریمِ یار میں جب صبح و شام ہوتے تھے

رہے زمین پہ اشغالِ صبر و شکر و رضا
اس ارمغاں کے کہاں اختتام ہوتے تھے

ہر ایک کام فراوانیِ جنوں میں کِیا
سوادِ ذات میں جو جو بھی کام ہوتے تھے

ستم شناس تھے ، درد و اَلم کی مستی تھی
حصارِ یار میں جب صبح و شام ہوتے تھے

جنوں سے اِس لیے ہم نے معاملات کیے
خرد شعاری میں سودائے خام ہوتے تھے

کہاں گئے وہ پرندے ، کہاں گئے باغات
جو میرے ساتھ کبھی ہم کلام ہوتے تھے

فرحت عباس

# غزل

استقامت کے ساتھ رہتے ہیں
شان و شوکت کے ساتھ رہتے ہیں

رات دن انقلاب برپا ہے
کس قیامت کے ساتھ رہتے ہیں

زندگی ان کی دار پر گزرے
جو صداقت کے ساتھ رہتے ہیں

دل ہوں روشن چراغ بجھتے ہی
ہم امامت کے ساتھ رہتے ہیں

موت بھی ان سے ڈرتی رہتی ہے
جو شہادت کے ساتھ رہتے ہیں

پھول، تتلی ہے، رنگ و خوشبو ہے
نُور و نکہت کے ساتھ رہتے ہیں

ہم غلامانِ بوترابؑ عقیل
حق کی دولت کے ساتھ رہتے ہیں

عقیل رحمانی

# غزل

غم کی تکمیل کر گیا ہوں میں
اپنے حصے کا مر گیا ہوں میں

جان سے تو سبھی گزرتے ہیں
اپنی حد سے گزر گیا ہوں میں

جن کو دل میں سنبھال رکھا تھا
اُن کے دل سے اُتر گیا ہوں میں

پھر نئی دستکیں اٹھائے ہوئے
جانے کِس کِس کے گھر گیا ہوں میں

عمر کانٹے سمیٹتے گزری
پھول تھا اور بکھر گیا ہوں میں

شعر مشہور ہو گئے میرے
میں کہاں ہوں، کدھر گیا ہوں میں

ساری بستی میں مَیں تو پھیل گیا
وہ سمجھتے ہیں، مر گیا ہوں میں

**یونس خیال**

# غزلیں

آنکھ لگنے کی ، دل لگانے کی
بات ہوتی ہے کب چھپانے کی

عین ممکن کہ میں سنبھل جاؤں
دیکھ کر لغزشیں زمانے کی

کر ہی دیکھوں حقیر سی کوشش
لوحِ دل سے اُسے مٹانے کی

کھویا رہتا ہوں اس کی یادوں میں
جس کو عادت ہے بھول جانے کی

سرد آہوں سے جان چھوٹی ہے
"ہے خبر گرم اُس کے آنے کی"

ہم تو آنکھیں بچھائے رکھتے ہیں
آگے قسمت غریب خانے کی

سر اُٹھاتی ہیں کیسی افواہیں
اور وہ بھی بہار آنے کی

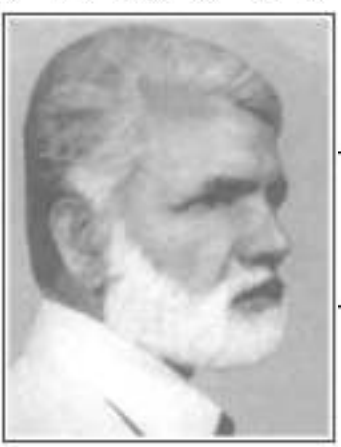

## یعقوب پرواز

مٹی کے معبود بنائے لوگوں نے
کیسے کیسے نام کمائے لوگوں نے

آج تلک آباد ہے دل کا ویرانہ
ورنہ کیا کیا شہر مٹائے لوگوں نے

چاند سا چہرہ بند کنویں میں ڈال دیا
بعد میں کتنے اشک بہائے لوگوں نے

لے ڈوبے گی پھر ایسی تائید ہمیں
اب کی بار بھی ہاتھ اٹھائے لوگوں نے

کیا بتلائیں وقت کے گدلے پانی میں
کیسے کیسے پھول بہائے لوگوں نے

ساتھ ہی اس کو حرفِ آخر گردانا
حکم دیا یا دی ہے رائے لوگوں نے

اپنے لہو سے پیاس بجھانے کی خاطر
زہر میں کیا کیا تیر بجھائے لوگوں نے

# غزل

شہروں نے غم اوڑھ لیا ویرانوں کا
کیا ہو گا اب ہم جیسے دیوانوں کا

طُوفانوں میں کون کسی کا ہوتا ہے
جب ہو خطرہ اپنی اپنی جانوں کا

اِس رُت میں تو پھُول بھی مسلے جاتے ہیں
یہ موسم تو قاتل ہے ارمانوں کا

تیرے بعد ادھورے سے لگتے ہیں سب
کیا رکھوں عنوان میں اِن افسانوں کا

جلتی رہنا جب تک نہ مر جائیں ہم
دل نہ ٹوٹے اے شمع پروانوں کا

آخر اِک دن ہم اُکتا ہی جائیں گے
کب تک غم پالیں گے اِن یارانوں کا

اپنی اپنی خاطر زندہ رہتے ہیں
یہ دنیا تو مرکز ہے نادانوں کا

ویراں ویراں لگتے ہیں پیمانے بھی
جانے یہ کیا حال ہوا میخانوں کا

ٹوٹ گئے اقبال جو ایک ہی جنبش سے
پُوچھ نہ مجھ سے حال تُو اِن پیمانوں کا

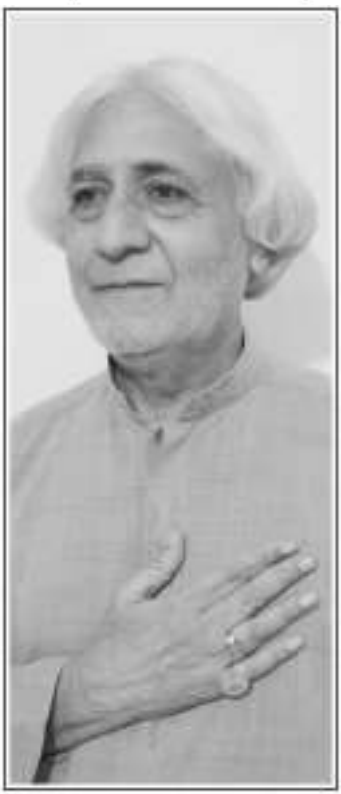

اقبال سروبہ

# غزلیں

رعنائیِ خیال سے آگے کی چیز ہے
شعر و سخن کمال سے آگے کی چیز ہے

اے دوست تیرے عارض و رخسار کا یہ رنگ
یہ لال رنگ، لال سے آگے کی چیز ہے

یہ زخم تیرے تیر یا تلوار کا نہیں
یہ زخم اندمال سے آگے کی چیز ہے

میں حسنِ لازوال بھی کیسے کہوں تجھے
تُو حسنِ لازوال سے آگے کی چیز ہے

دل کی دھمال اور ہی شے ہے مرے عزیز
دھڑکن کی تال، تال سے آگے کی چیز ہے

لہجہ کچھ اور چیز ہے لفظوں سے ماورا
شاہد یہ بول چال سے آگے کی چیز ہے

## افتخار شاہد

میں وہاں ہوں جہاں اداسی ہے
ہر طرف بیکراں اداسی ہے

آس یونہی نہیں پھلی پھولی
آس کا سائباں اداسی ہے

یوں تو کتنی علامتیں ہیں مگر
غم کا پہلا نشاں اداسی ہے

دل کے حُجرے کا حال مت پوچھو
غم مکیں ہے مکاں اداسی ہے

آج کی رات خوب گزرے گی
شام سے مہرباں اداسی ہے

اے مرے شوخ یہ بتا مجھ کو
تو نے رکھی کہاں اداسی ہے

کل مکانوں میں قید تھی لیکن
آج تو لا مکاں اداسی ہے

عشق گر ہیں بھی میں نے کھولی ہیں
سارا سود و زیاں اداسی ہے

میرا لہجہ ہے میر کے جیسا
میرا سوزِ نہاں اداسی ہے

عمر ساری گزار دی شاہد
آج بھی مہرباں اداسی ہے

# غزلیں

رشتوں کی یہاں پاؤں میں زنجیر پڑی ہے
پیچھے مگر انسان کے تقدیر پڑی ہے

دونوں میں سرِ مو بھی تفاوت ہو تو کہنا
یہ میں ہوں کھڑا یہ مری تحریر پڑی ہے

آنسو کا گماں ہوتا ہے یا قطرۂ خوں کا
جس لفظ پہ بھی روشنیٔ میر پڑی ہے

فکر و غمِ دنیا میں نمایاں ہے تری یاد
ردّی کے اک انبار میں تصویر پڑی ہے

تیاری شہاب آخری پرچے کی ہے شاید
سیرت ہے کہیں پر کہیں تفسیر پڑی ہے

## شہاب صفدر

بیروں دروں شکست کی صورت عجیب ہے
حالات کی طرح مری حالت عجیب ہے

بے حس ہے آنکھ منظرِ خوں گشتہ دیکھ کر
رگ رگ میں سرد لہر کی شدت عجیب ہے

اک شخص لڑ رہا ہے مگر سی کے اپنے لب
سب دے رہے ہیں دادِ شجاعت عجیب ہے

بچے بھی وار نے سے نہیں ٹلتے خاک زاد
ماں تجھ سے غم کشوں کی محبت عجیب ہے

جس منطقے میں آگ سے نم ناک سنگ ہیں
طاری ہے تم پہ نشۂ حیرت عجیب ہے

پابند کر دو آئے جو زنجیر کھینچنے
تاریک بستیوں کی روایت عجیب ہے

گھر بیٹھے منزلوں کے طلب گار ہو شہاب
بے موت چاہیے تمھیں جنت عجیب ہے

# غزل

خوشبوؤں، گلابوں نے تتلیوں نے ہجرت کی
جب گیا وہ گلشن سے گل رتوں نے ہجرت کی

بجھ گئے اجالے سب روشنی کے ہالے سب
کر کے شب سے سمجھوتے سورجوں نے ہجرت کی

وحشتوں کے منظر ہیں سارے کھیت بنجر ہیں
جب سے میری کھڑکی سے بادلوں نے ہجرت کی

وہ جدا ہوا تو پھر کیسے زندگی کرتے
دل سے زندگانی کے ولولوں نے ہجرت کی

اس کے اذن سے ہی دل سینے میں دھڑکتا تھا
حکم جب ملا اس کا دھڑکنوں نے ہجرت کی

اجڑے اجڑے گلشن میں شور تھا بپا ہر سو
جب کٹے درختوں سے پنچھیوں نے ہجرت کی

اس قدر نہ تھا آساں چھوڑنا ترے در کا
کیا بتائیں کس دل سے غم زدوں نے ہجرت کی

کتنے ضبط سے اس کو پہلے کر دیا رخصت
پھر چھلکتی آنکھوں سے آنسوؤں نے ہجرت کی

پہلے میری آنکھوں سے دور دور سپنے تھے
جب وہ آیا خوابوں میں رتجگوں نے ہجرت کی

شب گزیدہ رستے ہیں منزلیں بھٹکتی ہیں
جب جلیلؔ راہوں سے جگنوؤں نے ہجرت کی

احمد جلیل

# غزل

نقش بر آب ہو گئے ہیں ہم
نذرِ سیلاب ہو گئے ہیں ہم

کیسا پانی تھا اپنے چاروں طرف
جس میں غرقاب ہو گئے ہیں ہم

ڈھونڈے سے بھی نشاں نہیں ملتا
اِتنے کمیاب ہو گئے ہیں ہم

وقت اپنے لیے بچا نہ سکے
وقفِ احباب ہو گئے ہیں ہم

مر گیا ہو جو آنکھ میں ہی کہیں
ایسا اِک خواب ہو گئے ہیں ہم

تار ٹوٹے ہوئے ہیں سب اپنے
غم کا مضراب ہو گئے ہیں ہم

جو مسافر کے بھی نہ کام آئے
ایسا اسباب ہو گئے ہیں ہم

ایک دریا کو بھر کے آنکھوں میں
کتنے سیراب ہو گئے ہیں ہم

اُس کی نظروں میں آ کے ہم اشرفؔ
اور نایاب ہو گئے ہیں ہم

اشرف نقوی

# غزل

قدرت نے اپنا قرض اتارا ہے اور بس
اُس کے رُخِ حسیں کو نکھارا ہے اور بس

اب اور اُس کے حسن کی تعریف کیا کریں
کہہ جو دیا ہے سب سے وہ پیارا ہے اور بس

ایسا نہیں کہ ہر کسی کو راس آئے گا
آزارِ ہجر صرف ہمارا ہے اور بس

جینے کی آرزو تو اُسی روز مر گئی
اس سے بچھڑ کے وقت گزارا ہے اور بس

ہم وہ نہیں ہیں، جن کو زیادہ کی ہے طلب
ٹہنی سے ایک پھول اتارا ہے اور بس

آنکھوں کا آئنہ بھی کسی کام آگیا
اس میں تمھارا عکس ابھارا ہے اور بس

بھولے سے بھی جو حال مرا پوچھتا نہیں
طالب مجھے اُسی کا سہارا ہے اور بس

طالب انصاری

# غزل

وہ جو لوگ دل کی کتاب تھے وہ کہاں گئے
جو محبتوں کا نصاب تھے وہ کہاں گئے

وہ جو حسن تھا وہی حسن حسن نہیں رہا
وہ جو عشق کے سبھی باب تھے وہ کہاں گئے

وہ جو ہم نے سوچا تھا ویسا کچھ بھی نہیں یہاں
جو ہماری آنکھوں کے خواب تھے وہ کہاں گئے

وہ جو دوست اچھے تھے خوب اچھے تھے کیا ہوئے
جو ذرا ذرا سے خراب تھے وہ کہاں گئے

بھلا کیا ہوئے سبھی جگنوؤں کے وہ قافلے
وہ جو تتلیاں جو گلاب تھے وہ کہاں گئے

مرے ذہن میں یہ سوال کیسے سوال ہیں
جو مرے لبوں پہ جواب تھے وہ کہاں گئے

یہاں افتخار نہیں رہا کوئی افتخار
وہ جو آپ اپنا جواب تھے وہ کہاں گئے

**افتخار شوکت**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

فن و فنکار میں رشتہ ہے گل و خوشبو کا
فن و خوشبو بھی سرِ دوشِ ہوا رہتے ہیں

# غزل

جگنو کہاں گئے ہیں ستارے کہاں گئے
بھنورے، وہ تتلیاں، وہ غبارے کہاں گئے

نیندیں ہماری درد سے بھرنے لگی ہیں کیوں
سرہانے خواب رکھے تھے سارے کہاں گئے

چلنے لگی ہے آنکھوں میں یادوں کی فلم سی
ٹھنڈی ہوائیں، مست نظارے کہاں گئے

آلودگی نے کمروں میں یوں قید کر دیا
جھولے، بسنت، دھوپ کنارے کہاں گئے

آباد تھیں کناروں پہ دریا کے بستیاں
دریا تو بہہ رہے ہیں شکارے کہاں گئے

جذبات، دوڑتا ہوا جیون نگل گیا
لمحے جو ساتھ ہم نے گزارے کہاں گئے

کچھ لوگ تھے جو دل کے ہمارے قریب تھے
بچھڑے ہوئے وہ لوگ ہمارے کہاں گئے

شبہ طراز

# غزل

دے کر مجھے اُلفت کا یہ آزار، مرے یار
کر ڈالا مری زیست کو دشوار، مرے یار

یہ وادیٔ پُرخار ہے اور تیز ہَوا ہے
گر جائے نہ سر سے ترے دستار، مرے یار

دے گا مِرا ماضی مِری عظمت کی گواہی
ہوتی تھی مِری ذات ہی شہکار مِرے یار

کیا چیز پسِ پردۂ احوالِ جنوں ہے
کھل جائیں گے اِک روز یہ اسرار، مِرے یار

ہو جانے کو ہے ختم یہ ہستی کی مسافت
ہر شخص ہی چلنے کو ہے تیار، مِرے یار

ہر شخص یہاں زر کی پرستش میں مگن ہے
کوئی نہیں یوسف کا خریدار، مِرے یار

میں ہی تھا ندیم رہِ ہستی، سو مجھے بھی
کر ڈالا ترے عشق نے بے کار، مِرے یار

ریاض ندیم نیازی

# غزلیں

حال ایسا اس سے بعدِ ملاقات جو ہوا
نیندوں میں چلنا موجبِ عادات جو ہوا

آغاز ہو گئی تھیں سبھی غلطیاں مری
بھولے سے سر ہلا وہی اثبات جو ہوا

تشکیل دے دیا گیا عشاق کا گروہ
بدلہ لیا پتنگے نے اس رات جو ہوا

اس کا اثر پھر آتے برس تک نہیں گیا
اتنا فساد اس گھڑی بے بات جو ہوا

ہر وقت مانگتے ہیں ازل سے حقیر ہم
مالک سے، ربِ ارض و سماوات جو ہوا

لوگوں کو آج تک یہ پتہ چل نہیں سکا
مجھ میں ہے کون محوِ خرافات جو ہوا

اس کو بھی پورا پورا رہا تتلیوں پہ حق
پھولوں کے ساتھ چپکا ہوا پات جو ہوا

دریاؤں کا ظہور بھی ہوتا ہے آنکھ میں
اک قطرہ تھا وہ پانی کا برسات جو ہوا

رخشندہ میں نے گالی کبھی کم ہی دی مگر
عورت کو لوٹتا ہے وہ بد ذات جو ہوا

## رخشندہ نوید

دل کو آباد کیوں نہیں کرتے
تم ہمیں یاد کیوں نہیں کرتے

درد محسوس کیوں نہیں ہوتا
کوئی فریاد کیوں نہیں کرتے

ٹوٹ کر گر رہے ہیں تارے کیوں؟
پوری میعاد کیوں نہیں کرتے

عشق پھر سے زمین بوس ہوا
گہری بنیاد کیوں نہیں کرتے

شاید ایسے سکون مل جائے؟
طائر آزاد کیوں نہیں کرتے

ایسے بجھتی ہے انتقام کی آگ
اس کو برباد کیوں نہیں کرتے

آنکھ گر منظروں سے خالی ہے
رنگ ایجاد کیوں نہیں کرتے

# غزل

بام سے مجھ کو دیکھتا ہو گا
گاؤں میں کوئی تو مِرا ہو گا

پھول مرجھائے تو خیال آیا
اُس کے چہرے کا کیا بنا ہو گا

میں نے چپ سادھ لی شرافت سے
وہ یہ سمجھا کہ ڈر گیا ہو گا

اک تعلق جو اب نہیں باقی
جانے کس غار میں گرا ہو گا

میرا تجھ سے وہ آخری وعدہ
تیری دہلیز پر پڑا ہو گا

طائرِ خوشنما محبت کا
تیرے برگد سے اڑ گیا ہو گا

یونہی مجھ کو گمان تھا اصغرؔ
وہ مری راہ میں کھڑا ہو گا

اصغر علی بلوچ

# غزل

پیار کے انداز سے انجانے ہیں
ہائے ہائے آپ کتنے بھولے ہیں

نیند نعمت ہے ہوئے اب معتقد
خواب میں جب وہ ہمارے آئے ہیں

اک زمانے سے انھیں دیکھا نہیں
پھر بھی ذہن ودل پہ میرے چھائے ہیں

تم جو پہلے تھے وہی ہو آج بھی
ہم بھی پہلے سے نہیں کچھ بدلے ہیں

ان کی یادیں ہر نفس رہتی ہیں ساتھ
کون کہتا ہے وہ ہم سے بچھڑے ہیں

جانے کیسے لوگوں تک جا پہنچی ہے
ہم جو خوشبو قید کر کے رکھے ہیں

پھر بھی وہ ہی وہ ہے آنکھوں میں بسا
سامنے کیا کیا حسیں تر چہرے ہیں

ہم سے پوچھیں آپ احوالِ فراق
ہجر کے صدمات ہم نے جھیلے ہیں

جیسے ہو بیتاب مچھلی پانی بن
تیری خاطر ہم اے جاناں تڑپے ہیں

ذکی طارق

# غزل

اپنی مان کے جیتا ہوں
سینہ تان کے جیتا ہوں

بنتا ہوں انجان مگر
سب کچھ جان کے جیتا ہوں

خوف نہیں ہے لٹنے کا
بِن سامان کے جیتا ہوں

کیا کیا دل میں حسرت ہے
کیا کیا ٹھان کے جیتا ہوں

افضلؔ دھوپ میں ، یادوں کی
چھتری تان کے جیتا ہوں

**افضل ہزاروی**

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

ہَوا میں رنگ نہ بھر دے مری اُڑان کہیں
وہ تیر چھوڑ نہ دیں کھینچ کر کمان کہیں

# غزل

چاند کی سمت اک ستارا گیا
آسماں سے جسے اتارا گیا

صرف زنجیر میں نہیں جکڑا
دشت میں لا کے مجھ کو مارا گیا

اک اذیت سے میں پریشاں تھی
اک اذیت سے پھر گزارا گیا

کب مرے عکس کو رہائی ملی
کب مرا آئنہ سنوارا گیا

وہ ملیحہ پلٹ کے آئے گا
چھوڑ کر دوست جو ہمارا گیا

ملیحہ سیّد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیسی ٹھنڈی ہوا چلی خالد
چاند کیا ، جل بجھے ستارے بھی

# غزل

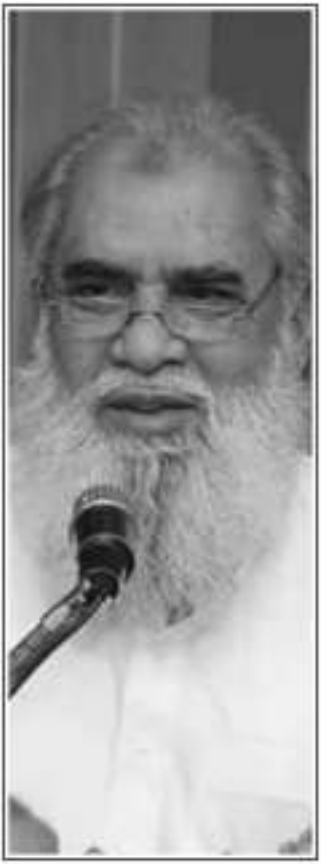

جو ہونے والا تھا سب کو بتا دیا گیا تھا
اور اس کے بعد دیئے کو بجھا دیا گیا تھا

مٹھاس بانٹی گئی ساتھ میں بوقت خلق
ہر ایک پھل کو الگ ذائقہ دیا گیا تھا

سنبھلنے کا اسے موقع دیا گیا تھا اور
وہ گر رہا تھا اسے آسرا دیا گیا تھا

وہ جس کے واسطے تخلیق دو جہان ہوئے
اسے اسی کا ہی تو واسطہ دیا گیا تھا

یہ اور بات وہ پھر بھی نکل نہیں پایا
نکلنے کا تو اسے راستہ دیا گیا تھا

وہ سٹپٹایا تھا کیوں پڑھتے ہی اسے اکرم
غزل کا شعر تھا یا آئنہ دیا گیا تھا

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھر ہاتھ پہ اک بُھول بھرے پَل سی ہیں کرچیں
پھر فرش پہ ٹوٹے ہوئے گلدان سا دن ہے

# غزلیں

درد میں چاشنی اس طرح ملا لی میں نے
شعر سے صورتِ خوش رنگ بنا لی میں نے

کوئی کیا سمجھے کہ دکھ شعر میں ڈھالے کیسے
کس طرح دشت سے یہ نہر نکالی میں نے

ایک لاوا کہ ابلتا ہی چلا جاتا ہے
ایک خواہش کہ جو سینے میں دبا لی میں نے

دیکھتے دیکھتے رنگوں کا فسوں ٹوٹ گیا
اور نظر خواب کے روزن سے ہٹا لی میں نے

رنج دیتا رہا ویرانۂ دل کا منظر
شکر صد شکر ہوس کوئی نہ پالی میں نے

رنگ تعمیر کے ڈھونڈے گئے مسماری میں
اور ملبے پہ ہی بنیاد اٹھا لی میں نے

مجھ سے دیکھی نہ گئی حسرتِ دیوار اب کے
ایک تصویر ہٹی ایک لگا لی میں نے

دین سمجھیں یہ کسی لمحۂ بیداری کی
کم سے کم نیند تو خوابوں سے چھڑا لی میں نے

تب دکھائی دیے سب دیکھنے والے جاذبؔ
جب نظر عکسِ گلِ تر سے ہٹا لی میں نے

## اکرم جاذب

میں ناطہ خوابِ گذشتہ سے توڑتا کیسے
فقط ہوس کے لیے رشتہ جوڑتا کیسے

بکھر گئے تھے جو تنکے کہاں بہم ہوتے
جو وقت بیت گیا اُس کو موڑتا کیسے

ابھی تو خواب بہت دیکھنے کو باقی ہیں
جب ایک ٹوٹ گیا آنکھیں پھوڑتا کیسے

کوئی دلیل کوئی بھی جواز کیا ملتا
جو ہاتھ تھام لیا میں نے چھوڑتا کیسے

میں روشنی کی طرف بس بلا ہی سکتا تھا
جو خوابِ مرگ میں خوش تھا جھنجھوڑتا کیسے

سوال زندگی کا ہے خبر تو تھی جاذبؔ
میں خالی ہاتھ مگر اس کو موڑتا کیسے

# غزلیں

نظارے سے جانا کہ حیرت ہمہ راز ہے
جو کھل جائے جس پر، وہی آئنہ ساز ہے

بیاباں سے ہم باغ میں آ گئے تو کھلا
خموشی خموشی ہے ، آواز آواز ہے

نہتّی رعایا نشانے پہ ہے رات دن
سمے تیر ہے ، دیوتا تیر انداز ہے

تجاذُب کی لہروں پہ رکھا ہے پہلا قدم
ابھی تو ہماری سیاحت کا آغاز ہے

کوئی دوڑتا ہے بدن تک، کوئی روح تک
ہر انسان کی اپنی اپنی تگ و تاز ہے

لباس اس کا ہے کائناتی غبار اِن دنوں
جنوں بیکراں وسعتوں کا ہوا باز ہے

سوار اِس میں ہیں دو مسافر اِسی خاک سے
یہ جنت سے آتی ہوئی پہلی پرواز ہے

ملایا ہمیں وقت کی تجربہ گاہ میں
خدا وند سب سے بڑا کیمیا ساز ہے

## شاہد ماکلی

بات چوپال سے چل پڑی، پھر نگر کی طرف مُڑ گئی
چلتے چلتے بھٹک کر کہانی خبر کی طرف مُڑ گئی

دن کے گنجان جنگل میں بے رہرَوی کے کئی موڑ تھے
دھوپ کچھ دُور جا کر غلط رہ گزر کی طرف مُڑ گئی

ایک مشکوک لمحہ کہیں زندگی کے تعاقب میں تھا
آنکھ جس سے بچا کر وہ راہِ مفر کی طرف مڑ گئی

وقت کے اک دوراہے پہ مجھ سے جدا ہو گئی آرزو
میں تو شب کی طرف مڑ گیا، وہ سحر کی طرف مڑ گئی

چاند کے ساحلوں پر کھڑے تھے کہ پہنچی زمیں سے خبر
شمسی ناؤ کسی کائناتی بھنور کی طرف مڑ گئی

مجھ میں یکجا تھیں سیّارو ثابت زمانوں کی پرچھائیاں
کوئی شامِ حضر، کوئی صبحِ سفر کی طرف مڑ گئی

زندگی خواب اُٹھائے رَواں تھی عجائب کدے کی طرف
جانے کیا جی میں آئی کہ نیلام گھر کی طرف مڑ گئی

# غزل

گلشن گلشن یہی اصول
جیسا موسم ، ویسے پھول

عاشق ہوں پر بشر بھی ہوں
ہو گئی ہوگی کوئی بھول

رختِ سفر میں گھر کا دھیان
ہم نے خاک اُڑانی دُھول

دو ہمراہی آپ میں گم
اِک رنجیدہ ، ایک ملول

ہائے بڑھاپے کے سپنے
خوش خوش جاتا ہوں اِسکول

آپ کی نذر کروں ہوں غزل
عزت پاؤں گر ہو قبول

جو بھی لگ کر کیا سحرؔ
آخر نکلا کام فضول

حسنین سحرؔ

# غزل

وقت کی رفتار سے یوں ربط پیدا کر لیا
اپنی ساری زندگی کو میں نے لمحہ کر لیا

کہکشاں در کہکشاں جس بھی قدر پھیلاؤ تھا
اس قدر کھینچا کہ اس کو اک تمنا کر لیا

نیند میں دیکھا اسے اور خواب میں چاہا اسے
نیند کا وقفہ تھا جس کو ایک دنیا کر لیا

سوچ کی سب کہکشائیں اور ان ہونٹوں پہ تل
میری ساری وسعتوں کو اس نے یکجا کر لیا

آئنے کے سامنے خود میں کھڑا تھا کس طرف
آئنے کے سامنے خود کو تماشہ کر لیا

بس، بشیر احمد حبیب! اس وقت بس خاموش رہ
تو نے رو رو کر جہاں میں خود کو رسوا کر لیا

بشیر احمد حبیب

# غزل

اداسی کے سمندر سے نکل جاتے ، تو کیا کرتے؟
یہ آنسو میری آنکھوں سے اُچھل جاتے، تو کیا کرتے؟

خزاں آتے ہی میں نے کاٹ ڈالی تھیں، جڑیں اپنی
اگر موسم مکمل بھی بدل جاتے، تو کیا کرتے؟

ہماری سوچ کا محور ہی دلدل سے گزرتا ہے
ہم اپنی راہ میں جاناں، سنبھل جاتے، تو کیا کرتے؟

جنہیں فرصت نہیں تھی پاؤں میں چھالے بنانے سے
وہ پتھر ہاتھ میں آ کر پگھل جاتے، تو کیا کرتے؟

جسے سب سرخ منظر سبز ہی دکھلائی دیتے ہوں
ہم اس کے سامنے سارے بھی جل جاتے، تو کیا کرتے؟

**عمران اعوان**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

جلدی نہ کر ، نظر سے اتر ، دیکھ بھال کر،
کہسار کے فراز کے نیچے سنبھل کے آ

# غزلیں

وہ میری محبت ہے وہی میرا یقیں ہے
جو شخص مرے دل میں، مری جاں میں مکیں ہے

جس شام ترا پیار ہوا دل میں فروزاں
وہ شامِ محبت ہی مرے غم کی امیں ہے

پھر کوئی کرن پھوٹ رہی ہے رگِ دل سے
شاید وہ اسی شہرِ تمنا میں کہیں ہے

اس دشتِ تحیر کے ہیں اسرار انوکھے
اس دشتِ تحیر میں کوئی شعلہ جبیں ہے

جس شہرِ محبت سے رہا تیرا تعلق
اس شہرِ محبت میں مرا یار مکیں ہے

ہر چند وہی شخص کبھی دشمنِ جاں تھا
ہر چند وہی آج مرے دل کے قریں ہے

## شفیق آصف

ہیں باقیاتِ خزاں مجھ سے ہمکنار آصف
میں کہہ رہا ہوں بہاروں سے بار بار آصف

مجھے کسی سے محبت نہیں تو پھر اب تک
میں کس کی یاد میں رہتا ہوں سوگوار آصف

ملی ہے مجھ کو یہ توقیر ماں کے قدموں سے
ہوا ہوں ماں کی دعاؤں سے باوقار آصف

عجب طرح کی ہے وحشت ہوائے صحرا میں
ہر ایک پھول کا دامن ہے تار تار آصف

میں نقشِ پا ہوں مجھے انتظار ہے کس کا
میں کس کے واسطے رہتا ہوں بے قرار آصف

جو خوش مزاج سراپا تھا تیری محفل میں
کیا ہے کس نے اسے آ کے اشک بار آصف

# غزل

جو بھی مظلوم کا غم خوار نہیں ہو سکتا
ہو بھلے سب کا ، مرا یار نہیں ہو سکتا

جس میں ہمت نہ ہو لڑنے کی کسی ظالم سے
وہ مری قوم کا سردار نہیں ہو سکتا!!

میری نسبت ہے محمد کے گھرانے سے میاں
میرا لہجہ کبھی تلوار نہیں ہو سکتا!!

جس کا ایماں ہو زر و مال و مناصب ،طاقت
وہ کبھی حق کا طرفدار نہیں ہو سکتا!!

پشت پر وار کروں، میں کبھی دشمن کے رضا
اتنا گھٹیا مرا کردار نہیں ہو سکتا!!

سید فرخ رضا ترمذی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جنگ دو گز زمین کی خالد
ہم نے اک عمر لڑ کے ہاری ہے

# غزل

سورج نے جب رات کے پہرے کھول دیے
میں نے بھی پھر چپ کے تالے کھول دیے

ہم نے بند کیے تھے اینٹ اور پتھر سے
دریاؤں نے سارے رستے کھول دیے

میں نے روشن دان کا شیشہ کھول دیا
اور پرندے نے پر اپنے کھول دیے

پانی سب کمروں میں بھرتا جاتا ہے
کس نے گھر کے سارے نلکے کھول دیے

شام سے پہلے بھولا واپس آیا ہے
میں نے گھر کے سب دروازے کھول دیے

کیسے کھولے اُس نے دل کے دروازے
جیسے بند کیے تھے ویسے کھول دیے

اُس کی یاد نے مجھ کو پاگل کر ڈالا
ایسے میرے ذہن کے پرزے کھول دیے

قرض چکانا ہو گا آج محبت کا
اُس نے آج پُرانے کھاتے کھول دیے

برسوں بعد کسی کو دیکھا ہے جبرانؔ
آنکھ نے مجھ پر کتنے سپنے کھول دیے

وسیم جبران

# غزل

طویل عمر کی ہرگز دعا نہیں بنتی
کہ زندگی سے ہماری ذرا نہیں بنتی

اکیلے پن کی اذیت سے خوف آتا ہے
وگرنہ آپ کی دل میں جگہ نہیں بنتی

یہ وقت سالوں بگولے سا ، لے کے پھرتا ہے
دو ایک دن میں کسی کی ہوا نہیں بنتی

ہر ایک بھیس میں ہم اُس کو جان لیتے ہیں
ہمارے سامنے یہ دنیا کیا نہیں بنتی

میں عام شہری ہوں مجھ کو چڑھائیں سولی پر
وہ خاص شخص ہے اُس کی سزا نہیں بنتی

احسان الحق مظہر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل بھر آئے تو سمندر نہیں دیکھے جاتے
عکس ، پانی میں اُتر کر نہیں دیکھے جاتے

# غزل

یہ کیا کہ آج مخمصے دل میں عیاں سے ہیں
آثار ہو بہ ہو کسی سیلِ رواں سے ہیں

احباب جن کے ساتھ گزاری تھی زندگی
اب وہ خیال و خواب میں وہم و گماں سے ہیں

کھارے ہیں ذائقے میں اگر سوچئے ذرا
آنکھوں میں اشک قلب کے بحرِ کراں سے ہیں

پت جھڑ سے استوار رہے ہیں بہار میں
گل سے تعلقات بھی دورِ خزاں سے ہیں

مدت سے ایک آس کو جنبش نہیں ہوئی
میرے سیاہ بخت بھی کوہِ گراں سے ہیں

جانا اگر ہے ان کو نئی منزلوں کی اور
تو یہ بھی پوچھئے کہ یہ آئے کہاں سے ہیں

مر کر بھی عابدی کو مفر ہو کہاں جناب
دن رات زندگی کے شبِ امتحاں سے ہیں

علی حسین عابدی

# غزل

جلا کے طاق پہ رکھتے ہیں صف بہ صف یہ چراغ
ہوا کی آنکھ میں چُبھنے دو لَو بکف یہ چراغ

ہزار بھید وہ سینے میں لے کے بُجھتے ہیں
شبِ سیاہ کے بنتے ہیں جب ہدف یہ چراغ

کہانی کار کا چہرا نہ تیرگی میں کھلے
سو داستان سے کرنا ہیں اب حذف یہ چراغ

ہماری آنکھ ہی منصف تھی تیرگی کا ثبوت
سو کاغذات میں رکھ دیں گے کر کے لف یہ چراغ

بجھے یوں شام کے ہاتھوں کے رائگاں نہ ہوئے
ہماری راکھ سے جلتے ہیں ہر طرف یہ چراغ

عاطف جاوید عاطف

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تنہائی سی تنہائی تھی ، کرتا بھی تو کیا میں
سو ، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا میں

# غزل

اہتمامِ عشق میں آئے فضائل خواب میں
آستانِ ذکر میں بیٹھے ہیں سائل خواب میں

اے خدا! مجھ میں سرایت کر گیا تیرا جمال
تیری ہمراہی میں ہے نورِ شمائل خواب میں

جاگتے لمحوں میں میرے رہنما بنتے ہیں وہ
دیتا رہتا ہوں میں اکثر جو دلائل خواب میں

کارنس پر سج گئی تصویر پہلے سانس سے
وا ہوئے مجھ پر مرے سارے مسائل خواب میں

وقت کی رفتار سوچوں میں بٹھا کر دیکھنا
ختم ہو جائیں گے پھر سارے مسائل خواب میں

جھوٹ کی بنیاد پر خوش رو بھی سچے ہو گئے
دیکھتا ہوں سچا ہونے کے خصائل خواب میں

درد بھی اب تو انیسؔ احمد میاں اک خواب ہے
لکھ رہا ہوں اب وفاؤں کے رسائل خواب میں

انیس احمد

# غزلیں

یوں ترے ہجر کا وظیفہ کیا
پل میں ہی رات کو لپیٹ دیا

زندگی کا تو جام تھا بھرپور
میں نے شاید بس ایک گھونٹ پیا

تو نے مجھ سے مرے حقوق لیے
اور مری عمر کو بھی تو نے جیا

رات جو ادھڑی کھینچا تانی میں
پھر سے اک دن پکڑ کے رات کیا

شام کاسے میں بھر کے لائی سوال
رات بھر ایک اک جواب سیا

اپنے سائے سے کھیلتا ہوں میں
گھر کی دیوار پہ جلا کے دیا

جب میں اوصاف لڑکھڑانے لگا
اپنے سائے کو میں نے تھام لیا

## اوصاف شیخ

کہاں بارش ہوئی بادل کہاں ہے
مہکتا ، بھیگتا جنگل کہاں ہے

ہماری الجھنیں قابو سے باہر
ہمارے مسئلوں کا حل کہاں ہے

ہے دشتِ نارسا اب بھی وہیں پر
مگر اس دشت میں وہ تھل کہاں ہے

یہاں راتیں ہیں روشن دن کے جیسے
وہ اس کی آنکھ کا کاجل کہاں ہے

خداؤں میں خدا کو ڈھونڈتا ہوں
کوئی مجھ سا بھلا پاگل کہاں ہے

وہ کل اوصاف جو بدلے گا موسم
ہماری عمر میں وہ کل کہاں ہے

# غزل

میں خواب میں ڈرتا رہا اک خواب سے پہلے
یعنی گئی تسکیں مری اسباب سے پہلے

میں جان بچانے کے لیے چیخ رہا تھا
موت آ گئی لینے مجھے احباب سے پہلے

اترا ہے جو پانی تو اسے کھوج رہا ہوں
گھر میرا یہیں تھا کہیں سیلاب سے پہلے

ملاح کا دریا پہ یہ الزام ہے ورنہ
کشتی کو ڈبویا گیا گرداب سے پہلے

اب جھیل سے پہلے بھی وہی سرد فضا ہے
اک جھیل ہوا کرتی تھی برفاب سے پہلے

یہ تنگیِ داماں کی کہانی بھی عجب ہے
دریا تھا یہاں چشمۂ پایاب سے پہلے

کرتا ہے طواف آج بھی اک قبر کا پانی
اک پیاس وہاں دفن تھی سرداب سے پہلے

کچھ لوگ بنے منبر و محراب کی زینت
پر تھے وہ کہاں منبر و محراب سے پہلے؟

یہ بات فقط تخت نشینی کی نہیں ہے
اک باب ہے تاریخ کا اس باب سے پہلے

سرکار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے کسی مرشد سے ملا دو
واقف تو میں ہو لوں ادب آداب سے پہلے



**علمدار حسین**

# غزل

ایسا لگتا ہے کہ اب اور کہیں نکلے گا
آج کی رات یہاں چاند نہیں نکلے گا

آنکھ کو چاندنی میں غسل دو اور پھر دیکھو
ایک سے ایک شبستاں میں حسیں نکلے گا

اُس گلی ہی کے کسی کونے میں ڈھونڈیں مرا دل
مجھے معلوم ہے آوارہ وہیں نکلے گا

گاؤں کے سادہ مزاجوں کی نہ تحقیر کرو
ان عجب رنگ چٹانوں سے نگیں نکلے گا

وہ جو ہجرت کی کڑی دھوپ میں پارس ٹھہری
ایک چشمہ اسی ایڑی کے قریں نکلے گا

چاند تارے بھی سلامی کو اتر آئیں گے
سیرِ گلشن کو وہ جب زہرہ جبیں نکلے گا

راہ میں تیری بچھائے ہیں یہ کنکر کس نے
پیچھے پردے کے کوئی پردہ نشیں نکلے گا

سر بسجدہ تو رضاؔ رونے کی عادت کر لے
آنکھ کا موتی سرِ عرشِ بریں نکلے گا

رضا اللہ حیدر

# غزل

کیسے ساتھ نبھاؤں گا میں ایسے میں
میری تو منزل ہے تیرے رستے میں

پہلے تو کی میں نے بات محبت سے
پھر سمجھایا اُس کو اُسی کے لہجے میں

اب ہم دونوں آزادی سے رہتے ہیں
قُدرت نے ہم کو باندھا ہے رشتے میں

بن جاتا ہے یہ کمزوری لوگوں کی
کِتنی طاقت ہوتی ہے اِس پیسے میں

تُو نے تو بس مجھ میں خُوبی دیکھی ہے
ہوتے ہیں سو عیب بھی لیکن بندے میں

تُم حُسنِ تخلیق بھی کہہ سکتے ہو اِسے
یہ جو آدھا جُھوٹ ہے پُورے قِصّے میں

کیفی بیٹھ محبت سے کُچھ بات کریں
کیا رکھا ہے خاموشی میں، غُصّے میں

محمود کیفی

# غزل

نقاب نوچ سکا گر منافقین کے میں
سپولے مار ہی دوں گا یہ آستین کے میں

تمہاری بے رخی مجھ سے سہی نہیں جاتی
وگرنہ طنز بھی سہتا ہوں حاسدین کے میں

وہ اختلاف کا حق جو مجھے نہیں دیتے
کبھی قصیدے نہ لکھوں گا حاکمین کے میں

مرے خلوص میں پھر بھی کمی نہیں آتی
ارادے بھانپ تو لیتا ہوں مطلبین کے میں

میں چاہتا ہوں کسی روز آسماں سے ملوں
تمام دکھڑے سناؤں اُسے زمین کے میں

یقینِ پختہ ہے توحید میں مرا ارشدؔ
کھٹکتا ذہن میں رہتا ہوں مشرکین کے میں

ارشد محمود ارشد

# غزل

رسموں میں نہ رسموں کی روایت میں مریں گے
ہم لوگ مرے بھی تو بغاوت میں مریں گے

سب لوگ ترے نام سے پہچانیں گے ہم کو
ہم کو یہ خوشی ہے تری نسبت میں مریں گے

جذبات کا احساس یہاں کون کرے گا
مجنوں کی طرح دشت کی وحشت میں مریں گے

حیران ہوں کچھ لوگ کہ حیرت میں مریں گے
دریا بھی مری پیاس کی شدت میں مریں گے

خطرہ ہمیں دشمن سے نہیں اتنا زیادہ
ہم جب بھی مریں گے تو محبت میں مریں گے

کچھ نیند جدائی کے اندھیرے سے اُڑے گی
کچھ خواب تجھے پانے کی حسرت میں مریں گے

اس بار اکیلے نہیں جائیں گے یہاں سے
اس بار تو ہم غم کی شراکت میں مریں گے

ملنا ہے اگر ہم سے تو دل کھول کے مل لو
ورنہ کبھی ماضی کی حکایت میں ملیں گے

اشرف کمال

# غزلیں

وہ شوقِ دید کا عالم کہ پیشِ یار، می رقصم
نہیں کچھ رنجِ رُسوائی سرِ بازار، می رقصم

اگر چہ مُعتبر ٹھہرا مجھے وہ جُبّہ و خلعت
سرِ ذوقِ جنوں کیا وقعتِ دستار، می رقصم

رہوں کیوں برگِ گُل پہ میں مثالِ قطرہ شبنم
میرے سر میں تو سودا ہے بہ نوکِ خار، می رقصم

اَدائے حُسن پہ تم ناچنا چاہو، چلو ناچو
ردائے عشق میں لپٹے گی جب گُفتار، می رقصم

وہ نُورِ لَم یَزل ٹپکے ہے اس چشمِ غزالاں سے
دمِ گُفتم چلے اَبرو کی جیکھی دَھار، می رقصم

پسِ دیوار تو سائے بھی محوِ رقص ہوتے ہیں
یہ ضد ہے میری سُورج سے، سرِ دیوار، می رقصم

منم الطافِ دَرماندہ کہ خاکِ راہِ دَرویشاں
یہ ہے عزّ و شرف میرا، کہیں سرکار، می رقصم

## سید الطاف بخاری

روشنی کے رنگ سارے آپ کے
دل کشی کے سب نظارے آپ کے

ایک مدت سے لئے پھرتا ہوں میں
دامنِ دل میں خسارے آپ کے

خوشبوؤں کے دور تک پھیلے ہوئے
ہیں سبھی رستے سنوارے آپ کے

کس میں ہمت ہے کسی بھی حال میں
درمیاں آئے ہمارے آپ کے

دن وہی حاصل ہیں میری زیست کا
ساتھ جو میں نے گزارے آپ کے

زندگی کی تاب کیسے لا سکیں
وہ جو ہیں فرقت کے مارے آپ کے

آپ کے بُجز کون ہے الطاف کا
یہ تو زندہ ہے سہارے آپ کے

# غزل

اِس زمیں کا بڑا مسئلہ لوگ ہیں
یہ خدا کے سوا جو خدا لوگ ہیں

کل عجب واقعے پر میں ہنستا رہا
بے وفا نے کہا ، بے وفا لوگ ہیں

تیرے میرے مسائل ہیں یوں مختلف
تو مرا اور ترا مسئلہ لوگ ہیں

کچھ کہا بھی نہیں اور سنا بھی نہیں
پھر بھی حد ہے کہ مجھ سے خفا لوگ ہیں

پہلے بولا نہیں پھر اشارہ کیا
اس نے آنکھیں گھمائیں کہا، لوگ ہیں

سوچ کر یہ میں ان سے الجھتا نہیں
منہ لگانے کے قابل یہ کیا لوگ ہیں؟

آخرش یہ صغیرؔ اُن سے کہنا پڑا
اور بھی کچھ تمہارے سوا لوگ ہیں

صغیر احمد صغیر

# غزل

وہ مہذب ہیں سو وہ مکر جائیں گے
ہم سے بزدل ڈرے تو سنور جائیں گے

کب ملاقات یہ بے نتیجہ رہی
تم بھی گھر جاؤ گے، ہم بھی گھر جائیں گے

شعبدہ گر کے ہاتھوں میں منزل نہیں
سازشوں کے یہ پتے بکھر جائیں گے

یوں تذبذب میں رہنا مناسب نہیں
جس طرف وہ گئے، ہم ادھر جائیں گے

ہم نے چاہا کہ دنیا سے جانا نہیں
لاکھ حیلے کریں گے ، مگر جائیں گے

سعدیہ بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ کو خرید پیار بھرے بول ، بول کر
قیمت چکا مری ، سر بازار دوستی

# غزل

بچھڑ کے اُس سے ذرا سا اُداس بھی نہیں ہے
عجیب دل ہے طبیعت شناس بھی نہیں ہے

گئی رُتوں کا وہ سبزہ کہاں سے لے آئیں
ہمارے پاؤں میں تو خشک گھاس بھی نہیں ہے

نجانے کس کی نظر لگ گئی ہے کھیتوں کو
کھلی ہیں ڈوڈیاں، اُن میں کپاس بھی نہیں ہے

اِسی لئے تو مسلسل غموں میں رہتا ہوں
خوشی کی آب و ہَوا مجھ کو راس بھی نہیں ہے

ذرا بتا! کوئی پچھتاوا تو نہیں ہے نہ اب
کوئی ہمارے یہاں آس پاس بھی نہیں ہے

ڈرے ہوئے ہیں سبھی لوگ موت سے لیکن
فضائے شہر میں خوف و ہراس بھی نہیں ہے

کوئی کشش تو پرندوں کو کھینچ کر لاتی
مگر ظہورؔ درختوں کو آس بھی نہیں ہے

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

# غزل

دستِ الم سے زخمِ جگر چھل نہیں رہا
شاخِ سخن پہ برگِ غزل کھل نہیں رہا

کھائی ہیں بحرِ زیست میں کچھ اِتنی ڈُبکیاں
ساحل مری نگاہ میں ساحل نہیں رہا

یوں آئنہ ہٹا ہے مرے درمیان سے
میں اپنے آپ کے بھی مقابل نہیں رہا

اب چُن رہا ہوں اپنے ہی ریزے اِدھر اُدھر
اب اپنے ہی وجود میں شامل نہیں رہا

جب سے کیا ہے نصب جبیں پر اک آئنہ
آئینہ میری دید کے قابل نہیں رہا

کس مرحلے پہ کھائے نہیں جان کر فریب
کس انجمن میں رونقِ محفل نہیں رہا

حیرت ہے پھر بھی زندوں کی صف میں کھڑا ہوں میں
حالانکہ میرے پہلو میں وہ دل نہیں رہا

سقراط کی شبیہ میں کیا رنگ بھر سکوں
رگ رگ میں زہرِ غم ابھی گھل مل نہیں رہا

جادہ بہ جادہ رُلتا ہوں اپنی تلاش میں
اب میرا عکس بھی سرِ منزل نہیں رہا

اِس جرم پر لگی مرے ہاتھوں میں ہتھکڑی
یہ کیوں ہماری راہ میں حائل نہیں رہا

مجنوں تو جی رہا ہے مگر جذب مر گیا
لیلیٰ تو پھر رہی ہے پہ محمل نہیں رہا

فیضانؔ دیدنی ہے نئی روشنی کی رات
جاہل سمجھ رہا ہے وہ جاہل نہیں رہا

فیض رسول فیضان

# غزل

نقش آنکھوں میں ہیں لمحے تری تنہائی کے
اب کہاں رہ گئے وہ دور شناسائی کے

وقت کی باتیں اگر مصلحت آمیز رہیں
تذکرے ہوتے نہیں دوستو دانائی کے

حال تدبیروں سے انساں کے بدل جاتے ہیں
ماجرے سُنتے چلے آئے شکیبائی کے

ظُلم اور جبر میں چِھنتا ہے سکوں انساں کا
وہ زمانے گئے اب فکر کی گہرائی کے

شہرِ آشوب کے آثار وہاں ملتے ہیں
ہیں کھنڈر ہستی کے پر رخ نہیں رعنائی کے

کون سے دور میں داخل ہوئے ہیں ہم آخر
کام آتا ہی نہیں بھائی یہاں بھائی کے

اُس نے آواز جو دی اپنے دریچے سے مُجھے
سُر مِرے ذہن میں رقصاں ہوئے شہنائی کے

کوئی بھی شخص نہیں ملتا یہاں پُر تاثیر
کُھل کے رہتے ہیں دریچے یہاں رُسوائی کے

تاثیر نقوی

# غزل

کر رہا ہوں شمار کتنے ہیں
سانپ کتنے ہیں یار کتنے ہیں

بندہ پرور بتا ناں تیری طرف
میرے بوسے ادھار کتنے ہیں

تیری آنکھوں میں دیکھ کر آنسو
لوگ اب اشکبار کتنے ہیں

زندگی دیکھ تیرے دامن میں
پھول کتنے ہیں ، خار کتنے ہیں

دوسروں پر اٹھاتے ہیں انگلی
لوگ خود داغدار کتنے ہیں

تجھ سے چلتی ہے سانس ہستی کی
تجھ پہ دار و مدار کتنے ہیں

تم بدن کے شمار کرتے ہو
زخم دل پر بھی یار کتنے ہیں

تاثیر جعفری

# غزل

تم سناتے ہو مجھے روز پرانی غزلیں
اتنی لکھ کر ہیں بھلا کس کو سنانی غزلیں

بس کرو اب تو، مکرّر نہ سناؤ مجھ کو
ایسا لگتا ہے کہ تم نے ہیں رٹانی غزلیں

میری غزلوں میں فقط تیرے فسانے جانم
بس بیاں کرتی ہیں تیری ہی کہانی غزلیں

اِن میں ہوتا ہی نہیں رنگِ تغزل بالکل
ذکر تیرا ہو تو ہوتی ہیں سہانی غزلیں

ڈھنگ کا کچھ نہ کیا کام حیاتی ساری
کھا گئیں میری تو بھرپور جوانی غزلیں

دل کی ہر بات چھُپا، ہونٹ بھی سی لے بے شک
کھول دیتی ہیں تری چُپ کے معانی، غزلیں

بعد مرنے کے نشاں کچھ تو رہے گا باقی
چھوڑ جاؤں گا فقط ایک نشانی، غزلیں

میرے اُس یار میں یہ بھی تو ضیاؔ ہے خوبی
جب سناتا ہے، سناتا ہے زبانی غزلیں

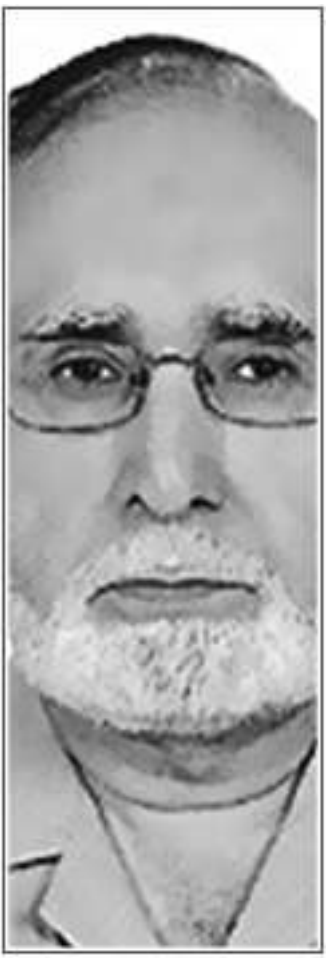

سید ضیا حسین

# غزل

جس دم تمہاری ذات سے میں نے کیا ہے عشق
مجھ پر کھلا یہ راز کہ نورِ خدا ہے عشق

کچھ دن سے گفتگو میں بھی ہوتا نہیں شریک
کچھ دن سے کیوں ملول سا رہنے لگا ہے عشق

لاؤں زباں پہ حرفِ شکایت مجال ہے !
جس نے دیا ہے درد اسی کی عطا ہے عشق

پوروں میں کس کو چھونے کی خواہش مچل اٹھی
یہ کون ہے یہ کس سے مخاطب ہوا ہے عشق

اہلِ نظر پہ اس کی حقیقت ہے آشکار
جو سیدھا راستہ ہے وہی راستہ ہے عشق

رہتے ہیں وہ حوادثِ دنیا سے بے نیاز
عشاق جانتے ہیں کہ ردِ بلا ہے عشق

دانش ہمارا جب بھی چمن سے گزر ہوا
ہم سے بکھرتے پھول نے پوچھا کہ کیا ہے عشق

اعجاز دانش

# غزل

مجھ سے بھی بڑھ کے مجھ پہ اجارہ ہے آج کل
اک شخص زندگی میں دوبارہ ہے آج کل

چھایا ہوا ہے اس پہ خمارِ بہار ہجر
دل کو ہر ایک زخم گوارا ہے آج کل

آئے وہ شخص ہاتھ پہ بیعت کرے مرے
جس کو محبتوں میں خسارہ ہے آج کل

اس میں بھی ایک جہد مسلسل کا ہاتھ ہے
ہر شخص دیکھنے میں ہمارا ہے آج کل

اس کو یہ بات کوئی بتائے سلیقے سے
دیکھو علی ایاز تمہارا ہے آج کل

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اہل زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہر جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

# غزل

عِلم ہوتا نہیں بہاؤ کا
جُرم بنتا ہے محض ناؤ کا

دُوسرے عشق کا میں کیا سوچوں
درد کافی ہے پہلے گھاؤ کا

زندگی ہے یا کوئی اسٹیشن
کیا تماشا ہے آؤ جاؤ کا

موت اتنی حَسین لگ رہی تھی
میں نے سوچا نہیں بچاؤ کا

ایک لمحے میں مِٹ رہے گا سب
حُکم آیا اگر مٹاؤ کا

"فُرصتِ کاروبارِ شوق کسے"
وقت آیا ہے چل چلاؤ کا

دیکھ! مجھ کو تباہ کر گیا ہے
یہی انداز رکھ رکھاؤ کا

جنگ ہونے لگی کہانی میں
شُعلہ بڑھنے لگا الاؤ کا

بچنے والوں کو یاد ہے ہی نہیں
کوئی ملّاح بھی تھا ناؤ کا

ہم بھی جاتے نہیں وہاں انجم
خط بھی آتا نہیں ہے آؤ کا

امتیاز انجم

# غزل

عشق ہے یا بلا ہے کیا کہیے
ایک چہرے کے ہیں کئی چہرے

ضبط کی انتہا ہے کیا کہیے
'کون اچھا برا ہے کیا کہیے'

اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی میں
سَر جُھکانا جہاں نہیں ممکن

درد ہے رت جگا ہے کیا کہیے
دِل وہیں پر جھکا ہے کیا کہیے

گونجتی ہے جو اب بھی کانوں میں
شہرِ جاوید چھوڑے عرصہ ہوا

میرے دِل کی صدا ہے کیا کہیے
کچھ خبر نہ پتا ہے کیا کہیے

پارسائی ہے نارسائی تک
وصل میں سب روا ہے کیا کہیے

جاوید ڈینی ایل

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

چند رفیق مطمئن ، چند حریف دنگ بھی
ایک فریبِ صلح بھی ، ایک فریب جنگ بھی

# غزل

محبت نے دیا تھا ساتھ کچھ دن
میں پھر تنہا ہوں اب، جیسا تھا پہلے

مسیحا بن کے آئے خواب جھوٹے
میں پھر ہوں جاں بلب، جیسا تھا پہلے

وہ محمل جھومتا ، وہ دوڑتا قیس
وہی دشتِ عرب ، جیسا تھا پہلے

وہی بے رنگ گل، چپ چپ سے پنچھی
وہی منظر ہے سب ، جیسا تھا پہلے

نہ آئینے ، نہ خود آرا ہیں باقی
نہ وہ شہرِ حلب ، جیسا تھا پہلے

مزاج اس کا نہ آیا کچھ سمجھ میں
وہ ویسا ہی عجب ، جیسا تھا پہلے

ستم گر ، بے وفا ، بے درد ، غافل
وہی ہر اک لقب ، جیسا تھا پہلے

دیا ہے آنکھ نے دھوکا مجھے پھر
وہی رنگیں سبب ، جیسا تھا پہلے

تھی کچھ تو میری وجہ خود فریبی
وہ بت تو اب ہے، رب جیسا تھا پہلے

خدایا! نام اک رحمان تیرا
وہی مجھ پر غضب ، جیسا تھا پہلے

قرینہ موت بھی ہے عاشقی کا
رہا میں بے ادب ، جیسا تھا پہلے

غلام مرتضیٰ

# غزل

ظالم نظر سزاؤں کا منظر بھی آئے گا
محشر میں تجھ پہ اک نیا محشر بھی آئے گا

منہ پھیر کے جو پاس سے گزرو گے بار بار
آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر بھی آئے گا

مجھ کو تباہ کر کے ابھی شاد ماں نہ ہو
تیرا کیا دھرا ترے سر پر بھی آئے گا

جو شخص کھو گیا ہو کہیں اپنی ذات میں
کیسے اَنا کے خول سے باہر بھی آئے گا؟

ہر ایک کی جو راہ میں کانٹے بچھاؤ گے
لازم کسی کی اور سے پتھر بھی آئے گا

اب تک تو راہزن ہی ملے ہیں قدم قدم
یارب بہم ہمیں کوئی رہبر بھی آئے گا؟

اڑنا ہے جتنا اڑ لے مگر اتنا یاد رکھ
تھک ہار کے کبھی تو زمیں پر بھی آئے گا

بیٹھا ہے اتنی دیر سے سر کو جھکا کے تُو
دستِ عدو میں لازمی خنجر بھی آئے گا

جس کو سنوارنے میں مری عمر لگ گئی
مجھ کو مٹانے اب وہ مقدر بھی آئے گا

شہاب اللہ شہاب

# غزل

کہا گیا جو نہ اس سے مجھ کو وہ لہجہ اس کا بتا رہا تھا
کوئی تو تھا درمیان اپنے جو فاصلوں کو بڑھا رہا تھا

نجانے کتنے گلے چھپائے نبھایا ہم سے یہ ساتھ اس نے
ملی قفس سے رہائی اس کو نیا جہاں اب بسا رہا تھا

غرض کے رشتے ہیں سارے رشتے چھڑا ہی لیتے ہیں سب یوں دامن
غرض تھی اسکی جو کل تلک وہ یہ رشتہ ہم سے نبھا رہا تھا

گلہ نہیں کیوں تھا اس نے چھوڑا کہ چھوٹنا ہی تھا ساتھ اک دن
گلہ تو یہ ہے وہ شخص مجھ کو یوں دشمنوں سے ملا رہا تھا

چھپائے دل میں ہزار صدمے گزار دی تھی حیات ہم نے
جو خود سے بھی تھا چھپایا ہم نے زمانے بھر کو سنا رہا تھا

ابھی کہیں پر تھی یاد باقی بھلانا شاید ہوا تھا مشکل
نظر میں اسکی تھا کچھ جدا سا نگاہیں اپنی چرا رہا تھا

زیاں کا احساس تھا اسے بھی جو لگ رہا تھا بجھا بجھا سا
فقط نبھانے کو ایک رشتہ تمام رشتے گنوا رہا تھا

نائلہ راٹھور

# غزل

دیکھ ! اس دوڑ میں تو راکھ بھی ہو سکتا ہے
سانحہ کوئی المناک بھی ہو سکتا ہے

یوں بھی مل سکتا ہے گم گشتہ منازل کا سراغ
کوئی میرا پسِ افلاک بھی ہو سکتا ہے

کچھ ضروری تو نہیں یہ بھی ہو پہلے جیسا
دوسرا موڑ خطرناک بھی ہو سکتا ہے

عین ممکن ہے جزیرے نئے دریافت کرے
تیرا شاعر کوئی تیراک بھی ہو سکتا ہے

عین ممکن ہے کوئی وقت کو تسخیر کرے
یہ مرا وہم بھی ، ادراک بھی ہو سکتا ہے

جھونک بھی سکتا ہے احمدؔ، مری آنکھوں میں وہ دھول
وہ جو سادہ سا ہے، چالاک بھی ہو سکتا ہے

احمد محمود

# غزل

اسی لیے مرا طرزِ بیاں اداسی ہے
دکھائی دے کہ نہ دے درمیاں اداسی ہے

تمہارے دل کا بھی احوال جانتی ہوں میں
وہاں ہی ہاتھ رکھوں گی جہاں اداسی ہے

تجھے سنبھال کے رکھنا مجھے ہی آتا ہے
مرے بغیر یہ سارا جہاں اداسی ہے

اسیرِ حسن بنا کر فریب دیتی ہے
یہ زندگی بھی بڑی مہرباں اداسی ہے

اوراب یہ روپ کی دیکھا اجڑی سلطنت میری
بڑا کہا تھا تجھے: ''میری جاں اداسی ہے''

اسے کہیں کہ محبت کا چھوڑ دے رستہ
جو کہہ رہا ہے کہ جی کا زیاں اداسی ہے

یہ انفرادی نہیں اجتماعی مسئلہ ہے
مجھے تو لگتا ہے سارا جہاں اداسی ہے

زباں نہ کھولوں گی مرجاؤں درد سے چاہے
اگر سمجھ نہ سکا وہ کہاں اداسی ہے

مسرتیں کہاں غائب ہوئیں تمہارے بعد
زمین رنج، زماں غم، سماں اداسی ہے

یہ میری اس کی جوانی تو ڈھلتی جاتی ہے
مگر ہمیشہ کی صورت جواں اداسی ہے

اسے ملی تو میں سیراب عنبرین ہوئی
پر اس کے بعد بڑی بیکراں اداسی ہے

عنبرین خان

# غزل

بند آنکھوں سے رُخِ یار بناتا کیسے
خام تصویر کو شہکار بناتا کیسے

زنگ آلود ہوئے پیار کے جذبے سارے
کند سوچوں کو میں تلوار بناتا کیسے

جس پہ صدیوں سے اندھیرا ہی رہا ہو غالب
وہ بھلا صبح کے آثار بناتا کیسے

جس نے جاتے ہوئے واپس نہیں دیکھا اک بار
اس کے انکار کو اقرار بناتا کیسے

جس کی بنیاد ہواؤں پہ ہی رکھی تو نے
ایسی بستی کوئی معمار بناتا کیسے

جب کہ گھٹی میں ہی شامل تھا محبت کرنا
خود کو نفرت کا طلبگار بناتا کیسے

تو نہ سمجھے گا مری جان یہ تشہیر کا دکھ
دل کے جذبوں کو میں اخبار بناتا کیسے

رانا محمد شاہد

# غزل

مہر علی

ہے بہت دور مجھ سے، مگر ہے
اِک ستارہ مرا ہم سفر ہے

اُس کو دیکھا تو احساس ابھرا
زندگی کس قدر مختصر ہے

ہم کو جانا ہے شاید کہیں اور
یہ زمانہ تو بس رہ گزر ہے

گزرے منظر مرے سامنے ہیں
رات ہے وہ گلی ہے وہ گھر ہے

توڑ لیتا میں اُس کے لیے پھول
ایک تتلی مگر شاخ پر ہے

تیری آہٹ نگر میں نہیں تو
کتنا چپ چاپ سارا نگر ہے

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم گوش بر آواز پھرے ہیں خالد
ہم نے جی بھر کے سنا ، پختہ گروں کا رونا

# یارک اَیٹ نائٹ [کہانی]

چلو ڈاکٹر صاحب، جوتے پہنو۔
سیالکوٹی ساتھ کھاپی کے گلے مل کے چلا گیا۔
شاکر مجھے کہے، اُٹھو۔
یار رات کے ڈھائی بج گئے، اب؟
سر جی، یہ نیویارک، اس کی آنکھ ہی اس وقت کھلتی۔
کھلی صاف شفاف، روشنیوں سے بھری سڑکوں پہ شاکر کی لمبی شیورلٹ بھاگی پھر رہی تھی۔ کبھی وہ کہیں لے جاتا، کبھی کہیں۔
''براڈ وے'' پہ نکلے تو میں حیران۔ پوری پوری بلڈنگوں پہ ٹیلی ویژن سکرین۔ روشنیاں اتنی کہ کسی کا بھی سایہ ادھر نظر نہ آئے۔ کہیں نہ کہیں ہر سڑک پہ کوئی لڑکی، کوئی لڑکا ایک دم سے اوپر بازو اٹھا کے کوئی اشارہ کرتا۔
شاکر سے پوچھا، یہ کیا اشارہ؟
بولا، ییلو کیب ہے نا یہ،
جنہیں ٹیکسی کی ضرورت ہوتی وہ یوں ٹیکسی آتی دیکھ کے بازو کھڑا کرتے۔
یار، اکیلی اکیلی ادھر سواری۔
تم بٹھالو۔
تمہارا روزگار بھی یہ۔
او ڈاکٹر صاحب، ساری عمر ہوگئی کماتے، چھوڑیں۔
یار آگے یوں میرے بیٹھنے سے، سواری برا تو نہیں مناتی؟
نہ جی، یہ آگے والی ڈرائیور کی سیٹ ہوتی ہے۔ سواری کی بس پچھلی سیٹ۔
تو بٹھالو یار، جو اشارہ کرے کُڑی۔ مجھے کسی خاص جگہ تو جانا نہیں۔ میرے لیے اِدھر کی ہر جگہ نئی، دلچسپ۔
یہ دیکھ، لڑکی نے بازو اوپر کیا،
روک۔
شاکر نے گاڑی روک لی۔
لڑکی نے ہیلو ہائے کہا، شاکر نے امریکی لہجے میں ہائے بولا۔ ڈیش بورڈ پہ لگی مشین پہ بٹن دبا کے ایک پرچی نکالی۔ لڑکی کے ہاتھ پکڑائی۔ لڑکی دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔

ابدال بیلا

گاڑی ''ایمپائر اسٹیٹ'' کے قریب سے گزرنے لگی۔
شاکر بولا دیکھ یہ۔
میں ڈیش بورڈ پہ دائیاں گال ٹکا کے اوپر نگاہیں ونڈ سکرین کے اندر سے دیکھنے لگا
میرے منہ سے خود بہ خود۔ اوئے، اُف، توبہ۔ قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔
پیچھے بیٹھی سنہری بالوں کو کندھوں پہ جھٹک کے ہنستی ہوئی شستہ انگریزی میں مسکراہٹ بھر کے بولی۔
مسٹر ڈرائیور، لگتا ہے، آپ کے دوست نئے نئے ''نیویارک'' میں آئے ہیں۔
شاکر بولا، نئے کیا، ابھی ائرپورٹ سے لے کر آیا ہوں، آج شام۔
اب وہ ''پری'' براہ راست مجھ سے مخاطب ہوئی۔
کس ملک سے اُڑے یہاں کے لیے؟
''فرانکفرٹ'' سے۔
اچھا آپ ''جرمنی'' میں رہتے ہیں۔
نہیں، اُدھر میں ''کوپن ہیگن'' سے اترا تھا۔
او، آپ ''ڈنمارک'' میں رہتے تھے۔
نہیں، ''سٹاک ہوم'' سے اُدھر پہنچا تھا۔
واہ۔ تو آپ ''سویڈن'' کے رہنے والے ہیں۔
نہ جی، رہنے والا میں پاکستان کا ہوں۔
یہ کدھر ہے؟ نام تو سنا ہوا۔
یہ پہلے انڈیا کا حصہ تھا۔ انڈیا اور ایران کے درمیان، چین کے نیچے۔
او، وا اُو۔ پھر تو ''ورلڈ ٹریولر'' ہوئے، آپ کیا دیکھنے کا شوق؟
ایمانداری سے کہوں تو، ہسٹری، کلچر۔
وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''ہسٹری'' دیکھنے کے لیے آپ کو صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔ سنٹرل پارک کے اردگرد سارے میوزیم، صبح نو بجے کھلیں گے۔ مگر ''کلچر'' دیکھنے کے لیے یہ قطعی صحیح وقت ---
میں گردن موڑے اُسی کی طرف پیچھے دیکھ رہا تھا، وہ سیٹ سے آگے ہوئی، اپنی آنکھوں میں شرارتیں بھرے خوب مستی کے موڈ میں تھی۔ سامنے سے آتی گاڑی کی بیم اُس کی آنکھوں پہ پڑتی تو اُس کی نیلی آنکھوں میں ''نیلم'' کے اندر باہر طرف سورج کی شعاعوں کی طرح لہریں لہراتیں، وہ اپنی بات مکمل کرنے لگی تو اُس کی آنکھوں کے نیلم مسکرائے، بولی۔
''کلچر'' دیکھنے کے لیے یہ مناسب ترین وقت۔ اپنے دوست کو کہیے، کسی ''نائٹ کلب''، ''سٹرپ ٹی ڈانس'' یا ''لائیو سیکس شو'' باہر گاڑی روکے۔
اندر جائیے۔
کلچر ہی کلچر۔
میں ہنسنے لگا۔ کہا،
''کلچر'' سے میری مراد دنیا کے ''کمپیر ایٹو کلچرز'' مختلف ادوار میں جیسے کہیں تمدن آتے رہے، وہ۔

او، تو آپ کوئی پروفیسر ہیں ''سوشل سائنسز'' کے۔
نہیں، طالب علم ہوں۔
او، لو، جس ''نائٹ کلب'' میں نے اترنا، وہ اگلے ٹریفک اشارے پہ۔ اگر آپ کا دوست برا نہ مانے، تو میں آپ کو، اپنے ساتھ لے چلوں، اگر واقعی آپ سٹوڈنٹ سمجھتے خود کو۔
میرے ساتھ ''شاکر'' بھی ہنسنے لگا۔
ہنستے ہنستے بولا، یہ ہیں تو میڈیکل ڈاکٹر، مگر کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ناول لکھتے ہیں یہ۔
او، ''آئی فیل پراوڈ'' مجھے خود فخر محسوس ہو رہا، ایک آتھر کے ساتھ کچھ لمحے گزارے کے۔ میں سچ اپنی یہ خوش نصیبی سمجھوں گی اگر آپ کی کتاب کا کوئی کردار بن سکی۔
آیئے میرے ساتھ۔
وہ اترنے سے پہلے، میرے کندھے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اپنی نیلی ''نیلم نگینے'' بھری آنکھوں میں بے حد اشتیاق بھر کے بولی۔
شاکر نے رکی گاڑی کے ڈیش بورڈ پہ لگی مشین کا بٹن دبا کے پرچی نکال کے اُسے دی۔ وہ اپنی جیکٹ کی جیب سے کچھ ڈالر نکال کے شاکر کو پکڑا کے، میرے پیچھے بیٹھی اترتے اترتے رک کے بولی۔
اس کلب میں ''سٹرپ ٹیز'' کرتی۔
جانتے یہ۔
ابھی تو یہ جیکٹ، جین، موسم کا لحاظ کر کے۔ اُدھر الگ ڈریس، وہ بھی اک اک کر کے اتارتی جاتی، تیز میوزک کی لے پہ، ڈانس کے ساتھ۔۔۔ دیکھا یہ ڈانس کبھی۔
نہیں، میں نے نفی میں سر ہلایا۔
پھر تو ضرور چلو۔
ایک بات تم سے پوچھوں گی پھر۔
کونسی بات؟
وہ ہنسی، اُس کی ہنسی تانبے کے تھال پہ پیتل کی گڑویوں کے گرنے جیسی آواز تھی۔ ہنسنے کا انداز فاحشہ جیسا تھا۔ ایسے لگا جیسے وہ اپنے بدن میں لہروں میں لہراتی، گاڑی میں ہی ''سٹرپ ٹیز'' دکھانے لگی۔ سیٹ پہ اس کے ہاتھ میرے چہرے کے قریب ہو کے بولی۔
ایک لمحے میں کھڑی گاڑی کے پہلو میں نائٹ کلب کی جلتی بجھتی روشنیوں کے ہالے میں، اُس کے خود پہ ڈالے سارے نقاب اتر گئے۔ وہ کسی روشنی کی پچکاری میں ایک لمحے میں معصوم سی بچی بن کے نکل آئی۔ میرے ہاتھ پہ اپنی انگلیاں رکھ کے، میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولی، اگر کہو گے تو آج ''سٹرپ ٹیز'' نہیں کروں گی۔
نہ نہ۔ تم۔۔۔ میں ہلکانے لگا۔
پتہ! اِدھر مرد، عورت کے جسم سے کپڑے کا پہلا ٹکڑا اترتے دیکھ کے شور مچاتے۔ ہر کپڑے کے ٹکڑے کو جسم سے دور جاتے دیکھ کے

تھرکتے، اُچھلتے، چیختے اور آخری کترن جسم سے جب اتارنے کی کوشش میں لگی ہوتی اُس وقت ابلنے لگتے۔ شوں شوں کھولتے۔ اور جب اتار دیتی وہ بھی تو، سب جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے۔ ایسا کیوں؟

بتاؤ نا۔ آپ تو ”آتھر“

چلو، آج کی ”سٹپر ٹیز“ آپ کے نام۔

جسم سے آخری ڈوری بھی اتار کے، بھاگی آؤں گی، آ کے تمہاری گود میں بیٹھ جاؤں گی۔

چلو،

وہ ”نیلم پری“ دروازے کا ہینڈل کھولے، ایک پاؤں اتارے، نائٹ کلب کی جھلملاتی تیز روشنیوں میں میرے انتظار میں رُکی، آدھی اتری، آدھی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پہ شہر کی ساری نائٹ کلبوں کا غازہ جیسے اترا ہوا تھا۔ اندر سے وہ کسی پاکیزہ آبشار کنارے، شفاف اچھلتے پانی میں ایک پیر رکھے، اپنی پیتل کی گاگر بھرنے کے انتظار میں ٹھہری ہوئی تھی۔

بولی، میرا نام ”ماریہ“ ہے۔

اُس نے عجیب سی محبت سے میرے ہاتھ پہ رکھا اپنا ہاتھ دبایا۔

میں نے اُس کے ہاتھ پہ اپنا گال رکھ دیا اور ہولے سے اُس کے ہاتھ کی پشت چومتے ہوئے کہا، جانتی۔

ماریہ، دنیا بھر کی مقدس ترین خاتون کا نام۔

میرے گال کے نیچے میرے ہاتھ پہ رکھا، اُس کا ہاتھ کپکپانے لگا۔ اُس کی ”نیلم آنکھوں“ میں نائٹ کلب کے سارے اچھلتے رنگ اتر گئے۔ لگتا تھا، اُس کی آنکھوں میں صبح ہونے لگی۔

گاڈ بلیس یو، ماریہ۔

اصل ”سٹپر ٹیز“ آج تم نے کھیلی۔ سارے چکا چوند رنگوں کو تم پہ اترتے دیکھا۔ اندر سے تم صبح کی طرح شفاف ہو۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈگمگانے لگے۔

اُس نے اپنی جیکٹ سے ٹشو پیپر نکال کے اپنی آنکھوں کو پونچھا۔ میں نے لپک کے اُس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے پکڑا اور کہا۔

ماریہ، اگر کچھ مانگوں، تو دو گی۔ وہ گاڑی سے اترا پیر بھی گاڑی میں رکھ کے بولی،

یس، اینی تھنگ۔

یہ، یہ ٹشو پیپر، یہ نہ پھینکو۔ یہ مجھے دے دو۔

اُس کی نیلم آنکھوں میں پھر ایک جھکڑ آیا۔

اُس نے اُسی ٹشو پیپر سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ شاکر حیرانی سے کبھی اُسے تکتا، کبھی مجھے دیکھتا۔ وہ تھوڑی دیر چہرہ اُسی ٹشو پیپر میں ڈھانپے بیٹھی رہی۔ پھر اُس ٹشو پیپر کو ہونٹوں سے لگا کے، اُسے چوم کے اُسے میرے ہاتھ میں دیتی ہوئی، آنکھیں پونچھ کے ایک دم اتر کے چلی گئی۔

گیلے ٹشو پیپر پہ اُس کے گلابی ہونٹوں کی مہر لگی تھی۔

☆☆☆☆☆

# پیاس

مسرت کلانچوی
ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

فیضان تھل کا رہنے والا تھا۔ وہ سات دن کے بعد، اپنی بیوی مومل کو واپس اپنے گھر لا رہا تھا۔ انھوں نے اپنا سفر صبح سویرے شروع کیا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ جب تک سورج کی کرنیں اپنی تپش سے ٹھنڈی ریت کو خشک کریں گی تو اس وقت تک وہ گھر پہنچ چکے ہوں گے۔

فیضان کو اس سے پہلے کسی عورت کے ساتھ سفر کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ نا آشنا تھا کہ جب ایک عورت پائیل پہن کر آہستہ آہستہ اپنے قدم اٹھاتی ہے تو پرندے بھی اس کی جھنکار سن کر اپنے گیت بھول جاتے ہیں۔ وہ عورتیں جو لاٹھی تھامے، سارا دن بھیڑوں کے ریوڑ کے پیچھے بھاگتی تھیں، ان کو بھی آج پتہ چلا تھا کہ کیوں پائیل دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جھنکتی ہے۔

مومل کی جلد دن کی سفیدی کی طرح چمکیلی تھی۔ اس نے ناک میں نتھلی پہنی ہوئی تھی۔ سات دن پہلے، اسے اپنے خاوند کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ آج ٹھنڈی ریت پر چلتے ہوئے جب وہ پانی کا ایک نالہ عبور کر رہے تھے، اس نے خود ہی اپنا نرم ہاتھ، فیضان کے ہاتھوں میں تھما دیا تھا۔

ساری زندگی فیضان نے کلہاڑے کے ساتھ لکڑیاں کاٹی تھیں اور اس کے ہاتھ سخت اور کھردرے ہو چکے تھے، جیسے ہی موبل کے ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو چھوا، اس کو یوں محسوس ہوا جیسے پھولوں نے کانٹوں کے سارے زہر کو چوس لیا ہو۔

”نیک بخت! کیا تم کو پیاس لگی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں تو۔ مجھے تو نہیں لگی۔“

”تم اتنی شرما کیوں رہی ہو؟ اتنے زیادہ سفر کے بعد، مجھے پیاس لگ رہی ہے تو پھر تمھیں کیوں نہیں؟ آؤ، ان جھاڑیوں کے سایے تلے بیٹھتے ہیں، پانی پیتے ہیں اور کچھ دیر آرام کرتے ہیں۔ کیکر کے درخت کے سایے میں، فیضان نے اپنے اور موبل کے جوتے اتارے۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی نہ سوچا کہ ابھی ایک لمبا سفر باقی ہے جبکہ ان کے پاس بہت کم پانی ہے۔ انھوں نے پیٹ بھر کے پانی پیا۔ ریت پہ، فیضان نے موبل کو ایسے ہی گلے لگا لیا جیسے سامنے والی دونوں شاخیں ایک دوسرے کے گلے مل رہی تھیں۔ سبز پتے اور کیکر کی پیلی پھلیوں نے خوشی خوشی تالیاں بجائیں۔ ہوا نے محبت بھرے گیت گنگنائے اور موبل فیضان کے بازو پہ سر رکھ کر سو گئی اور فیضان بھی اپنے خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔

لیکن سورج نے ان کے خوابوں کے مقابلے میں بہت تیزی سے سفر کیا اور آدھا دن گزر گیا۔ سورج کی کرنیں جب فیضان اور موبل کی آنکھوں میں پڑیں تو دونوں ہی چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ دونوں کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ان کے چہرے پسینے سے شرابور تھے اور ان کے لب خشک تھے۔

”دن گزر گیا ہے۔“ موبل کی آواز میں لرزش تھی۔ فیضان کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہ تھا کہ کیوں اور کتنا دن گزر گیا ہے؟ موبل بھی کچھ دیر کے لیے خاموش رہی، پھر اپنے جوتے پہنتے ہوئی بولی:

”کیا بہت سفر باقی رہ گیا ہے؟“

”نہیں --- زیادہ نہیں --- تم اتنی پریشان کیوں ہو، جب میں تمہارے ساتھ ہوں؟“

فیضان نے اپنے جوتے ایک دوسرے پہ مار کے مٹی جھاڑی۔ وہ جانتا تھا کہ ریت دوبارہ ان سے چمٹ جائے گی۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نہ اس نے ایسے جوتے پہلے کبھی پہنے ہیں اور نہ وہ دوبارہ کبھی پہنے گا۔ موبل نے بھی اپنے دوپٹے سے اپنا پسینہ صاف کر لیا تھا اور فیضان جمائیاں لیتا ہوا اس کو گھورنے لگا۔ اس کے لب بھی خشک ہو چکے تھے۔ اس نے سامان میں سے پانی کی

بوتل نکالی۔ اس نے مومل کو پانی کے کچھ گھونٹ پلائے اور کچھ خود بھی پیے۔ دونوں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

گرم ہوا نے ریت کے گرم ذرات اُڑا کر ان کے منہ بھر دیئے تب مومل نے اپنے گاؤں کو یاد کیا جہاں آجکل گنے کی فصل اپنی بہار پر تھی۔ جس نے درمیان چھوٹے چھوٹے نالے سانپوں کی طرح پیچ و خم کھاتے ہوئے گزرتے تھے جو کبھی کبھار فصل میں چھپ جاتے اور کبھی کبھار باہر نکل آتے۔ یہ نالے ان کنوؤں سے بہتے تھے جہاں مومل اور شیداں کھیلتے ہوئے بڑی ہوئی تھیں۔ سبز اور پیلی فصل دوستوں کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ لیکر کھیلتی اور جھومتی رہتی۔ نالے کے اردگرد، درختوں پر بیٹھے پرندے گیت گاتے اور مومل وہاں پر اپنی بھیڑیں چراتی۔

بانسری کی لے ہر سُو گونجتی لیکن مومل نے کبھی اس پہ کان بھی نہ دھرے تھے۔ اس نے اپنے بچپن میں یہ سنا تھا کہ اس کا منگیتر اس سے شادی کرنے کے لیے روہی سے آئے گا۔ جب اس نے فیضان کو دیکھا تو وہ اس کے خوابوں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔

فیضان بھی نا آشنا تھا کہ مومل جس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی تھی اور جو ایک ثانی کے لیے رونا شروع کر دیتی تھی۔ وہ اب جوان ہو چکی تھی اور اب وہ اصلی والی مومل بن چکی تھی۔ اس کی منگیتر ایک نوجوان عورت ہوگی اور اس کا قد اس کے کندھوں کے برابر ہوگا۔

یہ گرم ہوا اور بنجر زمین کے باشندوں کے لیے ایک خوبصورت خواب تھا کہ سرسبز اور بارش والے گاؤں کی ایک لڑکی اس کی بیوی بننے جا رہی تھی۔ اس نے مومل کو دیکھا جس کا رنگ کپاس کی طرح سفید تھا، اس کی آنکھیں کسی تازہ لبالب بھرے ہوئے تالاب کی طرح تھیں اور اس کا نازک جسم سریم کے درخت کی طرح تھا۔ وہ اپنے گاؤں کی طرح خوبصورت تھی۔

فیضان نے دوبارہ مومل کی جانب دیکھا جو تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ سورج کی چلچلاتی کرنوں نے اس کی بڑی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا فراک تھام رکھا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ، اس نے اپنے ماتھے پر رکھا ہوا تھا لیکن پھر بھی جھلستی کرنیں اس کی پلکوں کو جلا رہیں تھیں۔

''میں جانتا ہوں مومل۔ روہی کا یہ سفر تمہارے لیے نیا اور مشکل ہے۔ لیکن جب ہم گھر پہنچیں گے تو میں تمہیں ہمیشہ آرام دوں گا۔''

فیضان نے خواہش کی کہ کاش وہ شیشم کا گھنا سایہ ہوتا۔ وہ مومل کے لیے ٹھنڈی ہوا اور سایہ

لے آتا یا وہ آسمان پر بادل کی طرح پھیل جاتا۔ وہ زوردار بارش کرکے موبل کو بھگو دیتا۔ لیکن سورج نے ریت کے ٹیلوں کے ساتھ مشورہ کیا اور دوبارہ طوفانی آندھی شروع ہو گئی۔ یہ اتنی تیز تھی کہ دونوں کے قدم اکھڑ گئے۔ آندھی اپنی آگ برسانے کے بعد ختم ہو گئی اور ان کے گلوں میں صرف کنکر اور کانٹے رہ گئے۔

دونوں ہی بے بس ہو کر نیچے گر گئے تھے۔ فیضان اٹھا اور موبل کی مدد کے لیے دوڑا۔ وہ مرجھائے ہوئے گلاب کے پھول کی طرح بے ہوش ہو چکی تھی۔ پیاس کی شدت سے، اس کے لب روہی کی زمین کی طرح خشک ہو چکے تھے جہاں کبھی کبھار پانی کھڑا رہتا اور بعد میں وہ بھی قحط کی وجہ سے ختم ہو جاتا۔ اس کی پلکیں اتنی سیدھی تھیں جیسے وہ پلکیں نہیں بلکہ کانٹے ہوں۔ فیضان خود بھی ہانپ رہا تھا۔

"کیا ہمیں صرف دو دن ہی اکٹھے رہنا تھا؟" یہ سوچ کر فیضان کانپ اٹھا۔ اس نے بے بسی کے ساتھ آسمان کی جانب دیکھا۔ اس کو ایک اونٹ اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی پگڑی سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور دوبارہ دیکھا۔ اب اونٹ پر سوار نوجوان آدمی بھی نظر آ رہا تھا۔

"موبل۔۔۔ موبل۔۔۔ اٹھو۔ دیکھو کوئی فرشتہ ہمارے لیے پانی لیکر آ رہا ہے۔ ہم نہیں مر سکتے۔ ہمیں ابھی زندہ۔۔۔ یقیناً۔۔۔ ایک دوسرے کے لیے۔۔"

فیضان خوشی کے مارے پُرجوش ہو گیا۔ موبل نے بھی اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اونٹ سوار اس کی جانب آ رہا تھا۔ فیضان نے اپنی پگڑی ہوا میں لہرا کر اپنی جانب اس کو متوجہ کیا۔ اونٹ ان کی جانب دوڑتا چلا آیا۔ وہ بڑی سرخ آنکھوں والا ایک خوفناک آدمی تھا۔

"جناب۔۔ ہمیشہ جئیں۔۔۔ آپ کے پاس پانی ہوگا۔۔ صرف چند گھونٹ۔۔"

"ہاں۔۔" اس نوجوان نے چبھتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ جواب دیا۔ "میرے پاس تمہاری پیاس کے لیے پانی ہے لیکن میں بھی تو پیاسا ہوں۔۔" فیضان کے لبوں پہ پیاس کی خاموشی تھی۔ آدمی نے اپنا ہاتھ نیچے کی جانب بڑھایا اور موبل کو اس کے بازو سے پکڑ کر زبردستی اوپر کی جانب کھینچ لیا۔

اونٹ دوڑا، فیضان نے بھی اس کا پیچھا کیا لیکن اس آدمی نے دور سے پانی کی بوتل اس کی جانب اچھال دی۔ فیضان پانی کی جانب دوڑا۔ پانی قطرہ قطرہ اپنی پیاس بجھا رہا تھا جبکہ موبل لحہ بہ لحہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

# خون [افسانچہ]

بازار میں لاؤڈ سپیکر پر بار بار اعلان ہو رہے تھے کہ ہسپتال میں ایک مریض کو خون کی اشد ضرورت ہے۔ خون کا گروپ بی پازیٹو ہے۔ اگر کوئی مہربان مہربانی کر دے تو ایک زندگی اور قیمتی جان بچائی جا سکتی ہے۔

غریب کی کون سنتا ہے۔ بلڈ بنک والے اس کی شکل دیکھتے ہی کہہ اٹھے۔

ہمارے پاس بی پازیٹو خون دستیاب نہیں۔ آپ کسی رشتہ دار کو لے آئیں۔ اس مزدور کا اس شہر میں کوئی اپنا تھا ہی کب---؟ وہ تو وہاں پردیسی تھا۔ اگر کوئی رشتہ دار ہوتا بھی تو اس کے پاس اتنا وقت کہاں تھا۔ خون کی فوری ضرورت تھی۔

پھر چشم فلک نے یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھا ہسپتال کے مین گیٹ میں جو بازار کی طرف تھا، ایک سفید ریش باپ پاس گزرتے ایک ایک شخص کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر سوال کر رہا تھا۔

''خدارا! کوئی خون کا عطیہ دے کر میرے بیٹے کی جان بچائے۔''

ایک صاحب بولے،

''میں خود بیمار ہوں میرا خون مریض کو نہیں لگ سکتا۔''

بیماری کا محض بہانہ تھا۔

دوسرا نوجوان بولا

''میرا بلڈ گروپ اور ہے۔''

حالانکہ اس کا بلڈ اس کے بیٹے کی طرح بی پازیٹو ہی تھا۔

ان سے مایوس ہو کر وہ ایک اور صحت مند سرخ و سپید شخص کی طرف لپکا۔

''بابا آپ کو نظر نہیں آ رہا میں کمزور ہوں۔ میں بھلا کیسے خون دے سکتا ہوں۔

بابا--- حسرت بھری نگاہوں سے بھرے بازار میں انسان نما لوگوں کو دیکھتا رہا۔ اس بھیڑ میں لوگ ہی لوگ تھے انسان ایک بھی نہ تھا پھر وہ بدحواسی کے عالم میں وارڈ کی جانب لپکا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی چیخوں سے پورا وارڈ گونج رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

عاصم بخاری

# دِتا کاما

دِتا، پنڈ کا ایسا چلتا پُرزہ تھا جو سب کا سجن سب کا بیلی تھا۔ ویسے تو پنڈ کے چوک میں اس کی سائیکل سروس کی دکان تھی جو ایک دکھاوا تھی۔ جسے زیادہ تر اس کے شاگرد ہی سنبھالتے تھے ہاں اسے کبوتروں کا بہت شوق تھا جو اس نے اپنے اڈے پر پال رکھے تھے۔ لیکن وہ پنڈ کا ایک ایسا جیالا کارکن تھا کہ کسی کے گھر میں شادی ہو، خنثے ہوں، ختم ہو، جھنڈ ہو، یا مرگ، دتا وہاں ضرور پایا جاتا تھا گاؤں کے کسی گھر میں کوئی بھی کام اس کے بنا ادھورا تھا وہ ہر جگہ یوں کام کرتا نظر آتا جیسے پروگرام کا کرتا دھرتا وہی ہو، ہر طرف سے اسے آوازیں پڑ رہی ہوتی تھیں اوے دتے یار مصالحہ لادے، اوے دتے گوشت دھویا یا نہیں، دتے یار بالن مک گیا ہے لے آ، دتے سپارے لے آ میسیت سے، دتے جا پروہنیاں کو اڈے سے لے آ، دتے جہیز کا سامان آ گیا ہے اتروالے، دتے جا ذرا شہر سے میرا دوپٹہ تو پکیو کرا لا، ایسے سب کاموں کا کاما دتا ہی تھا۔ سب گھروں میں اس کی آمدرفت پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ پنڈ کا سانجھا کاما تھا۔ ویسے تو دتے جیسے کریکٹر آپ کو ہر محلے، گاؤں، دفتر یہاں تک کہ اسمبلی میں بھی مل جاتے ہیں لیکن دتے کی ایک خوبی تھی پہلی نظر میں اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ بندہ اس طرح کا سب دا سجن سب دا بیلی ٹیپ کا ہو سکتا ہے؟ ناممکن !!! وہ اس لیے کہ دتے کی مونچھیں بڑی شاندار قسم کی تھیں۔ موٹی، گہری ایسے جیسے سلطان راہی نے مولا جٹ میں رکھی تھیں وہ بھی راہی صاحب کا سچا فین تھا لیکن صرف مونچھوں کے معاملے میں۔ کردار میں وہ رنگیلا صاحب جیسا تھا ہر ویلے مخول مستی

سید تحسین گیلانی

عورتوں بچوں جوانوں بوڑھوں میں مقبول سب کا پسندیدہ سب کو گرویدہ کر لینے والا، بھئی بھلا کیسے نہ ہو اس نے کبھی کسی کو نہ کی ہی نہیں تھی۔ سب کے لیے ہمہ وقت دستیاب۔ ماتھے پر کوئی بل ڈالے بنا ہر وقت چوکس ہر دم تیار، غریب امیر کا فرق تو وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اگر رات کے دو بجے بھی کسی نے اس کا دروازہ کھڑکایا تب بھی اس نے کبھی نہ نہیں کی، ماسی مختاراں کی دھی کو بچہ بچی ہونے والا تھا تو رات کے تن وجے چاچے کمالے نے اسے جا کر جگایا۔ دتے چل یار گڈی بڑے دکھ میں ہے۔ دتا سائیکل لے کر ایسے بھاگا جیسے سب جانتا ہو، کہاں جانا ہے کسے لانا ہے کیا کرنا ہے اُسے کچھ بتانے کی لوڑ ہی نہیں پڑتی تھی۔ اس نے سائیکل اٹھایا اور نہر و نہر ساتھ والے پنڈ کی مشہور دائی بی بی بانو کے دروازے پر جا پہنچا اور اسے بٹھا کر ماسی مختاراں کے گھر فوراً لے آیا۔ ماسی کی دھی کو اللہ نے جوڑے دیئے تو وہ آج تک دتے کو پتر پتر کہتے نہیں تھکتی۔ سارے پنڈ نے اسے شاباشی دی اور چودھری نے بھی انعام دیا اور پھر یونہی ایک دن شکھر دوپہر تھی اور ملک صاحب کے منڈے کو کتے نے چک مار لیا تھا تو دتا ہی تھا جو اسے ساتھ والے پنڈ کے ہسپتال سے ٹیکے لگوا کر لایا تھا اور پٹیاں کرائی تھیں

ملک صاحب تو شہر گئے تھے اور کون کرتا!!؟
ملک صاحب نے بھی دتے کو اپنے اکلوتے پتر کی جان بچانے پر نواں دھوتی کرتا لے کر دیا تھا اور پنج سو روپیہ بھی انعام دیا تھا۔ دتے نے بڑا کہا نہ جی ملک صاحب پنڈ دے سارے بال میرے اپنے ای ہیں صاحب جی آپ مجھے یوں شرمندہ نہ کریں بس دعا دیں اور بابا جی دی قبر پر چراغ جلا دیں کافی ہے۔ ملک صاحب نے روتے ہوئے اسے گلے سے لگایا اور کہا ہمارے لیے تو رب نے تمھیں ہی بابا بنا کر بھیجا ہے دتے۔ رکھ لے شاباش رکھ لے۔ دتا تیس بتیس سال کا کڑیل جوان تھا پنڈ کی کئی کڑیاں اس پر فدا تھیں پر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتا تھا لیکن اک بات تھی وہ رہتا ہمیشہ باؤ بن کر تھا۔ مونچھ کو تیل لگا کر بال کنگھی کر کے عطر شطر لگا کر رکھتا تھا، بابا جی کے دربار کے ساتھ ایک کمرہ تھا وہی اس کی دنیا تھی، وہ اور کبوتر!! کہتے ہیں بابا جی کا ایک مرید تھا بابا ملنگ یہ اس کا پتر تھا اس لیے پنڈ کے لوگ اس سے خاص عقیدت بھی رکھتے تھے اور اس پر مکمل اعتبار بھی کرتے تھے وہ پنڈ کے ہر گھر کا راز دار تھا اور ہر گھر کا فرد سمجھا جاتا تھا کسی کا بھی دروازہ کھٹکھٹا کر روٹی مانگ لیتا اسے کوئی روک ٹوک نہیں تھی سب لوگ اس پر اعتبار کرتے تھے۔ جب چودھری جمال کی

کڑی کو ساتھ والے پنڈ کا اک منڈا بھگا کر لے گیا تو دتا ہی تھا جو ان کی کڑی کو اس شرط پر واپس ڈھونڈ کر لایا تھا کہ چودھری جی بچی سے غلطی ہوگئی اسے معاف کریں گے تو مل بھی جائے گی میں اسے لاؤں گا پر چودھری جی کہنا کچ نہیں۔ چودھری نے پہلے تو بڑا رعب دکھایا پر جب چودھرین نے رو رو کر چودھری کا منت ترلا کیا تو چودھری مان گیا۔ علاقے بھر کے سارے لفنگے کبوتر باز نوسر باز اس کے یار بیلی تھی۔ اصل میں لوگ اس لیے بھی اس کی عزت کرتے تھے۔ پنڈ میں ویسے تو چودھریوں کا راج تھا پر سچ تو یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں پر دتا حکومت کرتا تھا۔ نہ اس کا بنک بیلنس نہ گڈی نہ نوکر چاکر پر پنڈ میں دتے کا راج تھا۔ کرتوت اس کے کاموں والے تھے لیکن جب کبھی پنڈ میں واردات ہوتی یا کسی کی کڑی بھاگ جاتی سب دتے کی طرف دوڑتے تھے۔ واقعی دتے کے دو روپ تھے ایک وہ دتا جو سب کا سجن سب کا بیلی کا مادتا تھا اور ایک وہ دتا جو خاص موقعوں پر خاص روپ میں سامنے آتا تھا لیکن یہ کوئی روپ دھارن والا چکر نہیں تھا دتا ایسا ہی تھا وہ خود کو موقعے کی مناسبت سے اس ماحول اور وقت کے مطابق ڈھال لیتا تھا۔ کوئی دماغ نہیں تھا یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ بوہت ہشیار چلاک تھا وہ بس ایسا ہی تھا۔

جس کا جیسا مسئلہ اس کا ویسا حل دتے کے پاس موجود ہوتا تھا۔ جوان ہونے کے باوجود کبھی کوئی بری شکایت بھی دتے کی سامنے نہیں آئی تھی حالانکہ پنڈ کی ساری عورتیں، گڑیاں بابے کے دربار کے پاس جو ٹیوب ویل تھا وہیں آکر کپڑے دھوتی تھیں۔ کئی عورتیں دتے کو نامردی کے طعنے بھی دیتیں تھیں، کپاس چگنیاں ہوں یا گندم کاٹنے والیاں یا پھر جھگی والیاں سب کی نظر دتے پر رہتی تھی آتے جاتے دتے کی کھولی پر اک نظر مار کر دتے کو کبوتر اڑاتا دیکھ کر سبھی خوش ہوتیں اور کبھی کبھی تو لڑکیوں کی ٹولیاں مذاق مذاق میں باتیں بھی سنا جاتی تھیں۔ لیکن وہ بس ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ ایک بار سن انولی نے اسے ہو چھا ''وے دتے ترا کسے تے دل نہ آیا۔ کیوں وے؟'' تو دتے نے ہنس کر کہا ''دل ہوندا تب ای آتا نا۔ میرا پاس تے دل ای نہیں ہے کملی اے۔ میرا بابا کہا کرتا تھا کسے دے کم آنے وچ جو مزہ ہے نا وہ ہر مزے سے بھاری ہے۔ ایسی تاں چاکر آں جی تہاڈے وی تے تہاڈے وڈیاں دے وی۔ آپ حکم کریں دتا حاضر۔ ''جاوے دنیا تیرے نال ہمیں بھی کم پڑ گیا ہے ساڈا کم تے جناب کر دے نہیں''

دتے نے پھر اسے ہنس کر ٹال دیا۔

آج کل وڈے چودھری اللہ یار نے دتے کو

بلا ناغہ دن رات ڈیرے پر حاضری کا کہہ رکھا تھا۔ دتا صبح صبح ہی ڈیرے پر چلا جاتا موڑھے صاف کر کے، حقہ تازہ بھر کے، چلم دھر کے وہ ڈیرے پر ہی سارا دن رات گزارتا، چودھری صاحب ساٹھ کے پیٹے میں تھے، پہلی بیوی سے اولاد نہ ہوئی اور وہ بیمار رہنے لگی شاید کوئی عورتوں کی بیماری تھی، دیکھتے ہی دیکھتے سوکھ کر کانا ہو گئی اور سال پہلے اللہ کو پیاری ہو گئی۔ چودھری نے ابھی کچھ روز پہلے ہی نیا ویاہ کرایا تھا۔ سارے پنڈ میں نئی ووٹی کے چرچے تھے، جوان اور رج کے سوہنی تھی۔ بھلے چودھری نے لک لکا کر سارا کام کیا تھا پر پنڈ میں تو گنتی بچے دے تو سارے پنڈ کو پتا چل جاتا ہے۔ پر چودھری کو تسلی تھی کہ کسی کو سچ پتا نہیں اور وہ اسی میں خوش تھا۔

چودھری کے سر پر گیارہ پنڈوں کی پگ تھی، اکلوتا تھا، زمینیں، حویلیاں ٹریکٹر یعنی اللہ نے بیش بہا دولت دی تھی بس اولاد کی دولت نہیں تھی اور ڈھلتی عمر میں یہ اس کی سب سے بڑی پریشانی تھی۔ اس نے کوس کوس کا کوئی حکیم نہیں چھوڑا، کوئی گشتہ نہیں چھوڑا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دتے کو اس سب کی خبر تھی کیونکہ وہ چودھری کا ایک ہی رازدار تھا۔ چودھری نے علاج کے علاوہ دم درود جادو ٹونہ کچ نہیں چھوڑا تھا پر بات نہیں بنی، ڈاکٹری دوا بھی چل رہی تھی پر شوگر کی وجہ سے کوئی دوا پوری طرح کام نہیں کر رہی تھی، عمر ڈھل رہی تھی اور چودھری کو وارث چاہیے تھا۔ جو سب کچھ سنبھال سکے۔

چودھری نے بڑی سوچ بچار کے بعد بڑی رازداری اور خاموشی سے یہ شادی کی تھی۔ ووٹی کے آتے ای لوگوں کے لیے حوالی کے دروازے بند ہو گئے تھے سارے نوکر چاکر، کامے بھی چھٹی پر بھیج دیئے گئے تھے۔ دتے کو حاضر کر لیا گیا تھا۔

"اوے دتے ادھر آ میرے کول بیٹھ جا جیسا تو نے کہا تھا میں نے سب ویسا ای کیا یہ لڑکی وہی ہے جس کا تم نے کہا تھا، اس کے ماے کو پورا لکھ روپیہ دے کر اسے لایا ہوں۔ اسے میں نے سب بتا دیا ہے کہ مجھے وارث چاہیے۔!!

دتے نے کمینی سے ہنسی کے ساتھ مونچھ کو وٹ دیتے ہوئے کہا۔

چودھری جی میں تو کاما ہوں حکم کا غلام ہوں جی جو حکم مائی باپ کا!!

آپ کی مُچھ (مونچھ) نیویں نہیں ہونے دوں گا۔

جوڑے ہوں گے جی جوڑے۔

آپ کو تو پتا ای ہے چودھری صاحب ماسی مختاراں کی کڑی کا!!

☆☆☆☆☆

# یہ چارہ گر میرے......

میرے راستے سے ہٹ جاؤ، سارے چراغ گل کردو اور سب شمعیں بجھا دو۔

کیوں؟؟؟

میں اس انوکھے حکم پر سٹپٹا کر ہی تو رہ گیا۔

''میں آنکھیں پھوڑنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ جوزف''

آنکھیں پھوڑنے کا--- مگر کیوں؟؟؟

''خواب بہت دیکھنے لگی ہیں۔''

یہ امید افزا خبر تو وجہ مسرت ہے ڈیئر

''نہیں--- یہ کانچ کی چبھتے ٹکڑے ہیں۔''

افففف !! آخر اس قدر قنوطی کیوں ہو گئی ہو؟؟

''قنوطیت پسند نہیں حقیقت آشنا کہو--- جبر کی رتوں میں خواب کے بیجوں کا پھوٹنا عذاب کا اشارہ ہے۔ خواب پربتوں جیسے ہوتے ہیں-- دو رخے، دھوکے باز----- ان کے پار تعبیر کی خوش رنگ بستیاں نہیں کثرت سے درد و الم کی گھاٹیاں ہوتی ہیں---"

اوہ جینی ڈارلنگ !!! کم آن--- دھواں دھواں موسم کی کثافت سے بینائی کا متاثر ہو جانا ممکنہ امر ہے-- ادھر آؤ میرے پاس-- میری آنکھوں سے دیکھو --- ہو سکتا ہے جیسا تم سمجھتی ہو ویسا کچھ بھی نہ ہو-- ہو سکتا ہے یہ سب تمھارے غلط قیاس ہوں-- اس خواب میں اس پار شاید واقعی ہی کوئی پھولوں بھری وادی ہو جہاں دن کو سورج کے انتظار میں سسکنا نہ پڑتا ہو اور نہ ہی چاند کو چاندنی کے لئے مسافتیں طے کرنا پڑتی ہوں۔ جہاں جنگل میں درختوں پہ لٹکتے سانپوں کی پھنکار کی جگہ ہوا کے گیت گونجتے ہوں-- اور جھیل کے دودھیا پانی سے کھیلتی نیلی آنکھوں والی جل پری بھی وہاں بے فکری سے سنہری مچھلیوں کے ساتھ مل کر گنگناتی ہو --- ہو سکتا ہے نا کہ جسے میری آنکھیں تمھارے لئے سجتا سنورتا دیکھ رہی ہیں وہ سرسبز چوٹیوں میں گھری تمھارے خواب کی ہی خوشنما وادی ہو-- ہو سکتا ہے نا؟؟ میں نے تسلی دینے کی خاطر پوچھا۔ --- جس کا جواب میں ایک طویل وقفہ سکوت تھا۔

کچھ تو بولو جینی --- اس کی خاموشی سے اب میرا دل سچ مچ گھبرانے لگا تھا۔

**سیدہ آیت گیلانی**

بتاؤ نا ایسا بھی تو ممکن ہے۔ اس کو شانوں سے تھامتے ہوئے میں نے اپنا چہرہ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"ناممکن۔۔۔ جوزف ناممکن اور ناممکن۔۔۔ صرف۔۔ ناممکن ہوتا ہے۔ مطلب کسی بھی امکان سے انکار" جینی نے سر انکار کے ساتھ سر ہلایا تو اس کی پونی میں جکڑے اسے گھیرے بھورے بال بھی انکار میں دائیں بائیں حرکت کرنے لگے۔۔۔۔

میں نہیں مانتا۔۔۔ تمھیں یقین کرنا پڑے گا کہ ممکن ناممکن میں ہی ہوتا ہے جیسے لاوجود میں وجود۔۔ بس اس سے ربط کرنا پڑتا ہے۔۔۔ اڑان کے لیے ہوا سے ہم آہنگی، جیسے چلنے کے لیے قدموں کا زمین سے تمسک۔۔۔۔ اور اعتبار کے لیے حوصلہ تم صرف ایک بار میرے کہنے پر اس پار جھانکنے کی کوشش تو کرو۔۔ صرف ایک بار۔

کیسے کراوں جوزف۔۔ جبکہ میں جانتی ہوں سراسر نقصان میرا ہی ہوگا۔۔ ٹوٹے لہجے والی یہ وہ جینی تو نہ تھی۔ جو گرجتی ہوئی آتی تھی اور برستی ہوئی جاتی۔

کیسا نقصان جینی؟؟؟

"جن کے قدموں تلے زمین مستعار ہو اور سر پہ آسمان منتقسم ہو ان کی طرف سے جانے والی دعاؤں کے سب راستے بھی قسمت کے قہر سے مسدود ہوتے ہیں۔ وہ کسی بستی کے مکیں نہیں ہوتے۔ اپنے حصے کے زمین و آسمان کے قصے خوابوں کی صورت ہی انھیں بہکاتے ہیں اور پھر وہ لامکانی کا بوجھ اٹھائے زمان و مکاں کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ اندھا ہونا مرنے سے تو بہتر ہے جوزف۔"

اُف میرے خدا!!

ادھورا اعتبار۔۔۔ ادھوری زندگی ہی دے سکتا ہے۔۔۔ نکل آؤ اس بے یقینی سے باہر۔۔۔۔ میرے خلوص کا اعتبار کرو اور سود و زیاں سے ماورا ہو کر۔۔ سراپا اعتبار بن جاؤ۔۔ بس ایک بار اس پار جھانک کر تو دیکھو۔۔۔۔ یقین مانو، یقین ہی کامل ہوتا ہے۔

"جب میں ہی چہرے کا وہ رخ نہیں دیکھنا چاہتی جس کا حاصل نارسائی ہے تو تم کیوں اصرار کرتے ہو۔۔ تمھارا کیا فائدہ ہے اس میں؟؟؟"

جینی کے لہجے سے جھلکتے خدشے جس قدر میرے سکون میں دراڑیں ڈال رہے تھے اسی قدر اس میری بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ میں ہر صورت چاہتا تھا کہ وہ اس خوف سے آزاد ہو جائے جو دن بدن اس کے گلابی ہونٹوں اور رخساروں کی ساری

تازگی کو دیمک کی طرح چاٹتا جا رہا تھا۔
ہائے!! چمکتی آنکھیں کیسے سیاہ ماتمی لباس اوڑھتی جا رہی تھیں۔
میرا فائدہ ---؟؟ ---- میرا فائدہ تمھارا سکون ہے جینی دیکھو پلیز مان جاؤ— آؤ میری حیات کی بہار میری بانہوں کے چمن میں گل بن کر کھلو— میرے دل کی روش پہ گلگشت کو نکلو— یقین مانو آفتاب تازہ کی نرم کرنیں ہم پر نثار ہوں گی۔ میں نے ماحول کی تلخی کو پیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
اس کی جھکی آنکھوں نے میرا حوصلہ بڑھا رہی تھیں— میں نے دھیرے سے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا— تو لمس بھی میرا ہم زباں ہو گیا—
آؤ جینی!! اس سے پہلے کہ وقت کی سازش ہمارے قدموں میں صدیوں کے فاصلے بچھا دے۔
ہر وہم کا پھن کچل دو— آؤ قدم بڑھاؤ اور مڑ کر مت دیکھنا میں نے بانہیں پھیلا دیں تو جینی ناراض خوابوں کو منانے لگی— اس رات آسمان نے دیکھا چاندنی رات بھر جشن محبت کی مبارکباد دیتے ہوئے کلیوں کے کٹوروں میں خوشبو کے سندیسے انڈیلتی رہی تھی— چکور نے رقص کیا تھا اور ناراض خواب ایک ایک کر کے ستارے بن بن جینی کی پلکوں کا بوسہ لینے فلک سے اترتے رہے تھے—
پربتوں کی طرح ستاروں کی چال بھی کب سمجھ میں آتی ہے۔ سنا ہے یہ جن آنکھوں میں اتر آئیں نیندیں وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ قفس ہجر کے قیدیوں کی شاید اسی لیے آنکھ نہیں لگتی—
سنا ہے اس پار کسی کو زخم لگے تو آسماں والا ادھر سے مسیحا اتارتا ہے۔
برسوں گزرے جینی اس کی بے خواب آنکھوں کو نیلی چادر کے پیچھے چھپے مسیحا کی راہ تکتے برسوں گزر گئے ---- انتظار آنکھوں کی عادت بن گیا تھا مگر زخم لاعلاج ہی رہے— آج تند خو ہوا شاید کسی طوفان کے اشاروں کی زد پہ تھی— غیض و غضب میں ملبوس جھونکوں کی درپچوں سے ٹھن گئی تھی— کھڑکی کے پٹ زور زور سے آپس میں ٹکرائے تو جینی بھی کھانستے ہوئے ماضی سے حال میں کھنچی چلی آئی— ہوا صبح کے لوٹنے کا سندیسہ لائی تھی ---- دیوار پر لٹکتے کیلنڈر پر لکھی تاریخ کے ہندسے اسے وقت کے زندان میں مرغ بسمل کی طرح پھڑپھڑاتے محسوس ہوئے ----- ایک لمحے کو اسے لگا جیسے اس کا وجود بھی کوئی ہندسہ ہو --- اور زمان و مکاں کا دائرہ

کیلنڈر کا وہ صفحہ جس پر اسے رقم کر دیا ہو---
بے جان، بے حس ہندسہ--- موجود سے
معدوم تک کا مسافر ہندسہ--- آج اکتیس
دسمبر ہے--- بڑبڑاتے ہوئے گویا اس نے
خود کو اطلاع دی---
ہائے!!! پھر وہی رت وہی راتیں۔ایک
آنسو گالوں پہ پھسلا---
پھر ایک نیا دن پھر اک نئی شام--- دن تنہا
کب آتے ہیں بھلا--- رات کچھل پیری
کی طرح تعاقب کرتے ساتھ آتی ہے---
ہائے اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔
اب میں اس کمبخت کا کیا کروں--- آواز۔
مگر یہ من ہی من میں بلند تر ہوئی۔
یہ دن اور رات تو جیسے میری اداسی کا خون پی
کر جوان ہو رہے ہیں--- یہ دن نہیں راتیں
نہیں وحشتوں کا لباس پہنے بھیڑیے ہیں---
میرے وجود میں ہجر کے نوکیلے پنجے
گاڑنے والے بھیڑیے--- بوڑھی جینی کے
اندر کوئی کرلایا---
پر تم نہیں سمجھو گے میرے ادھورے
بت--- کیلنڈر کے ساتھ دیوار پر سجی تصویر
پہ نظر پڑی تو بے ساختہ وہ اسے پکار اٹھی---
آؤ تمہیں سمجھاؤں---
پر کیسے؟؟؟؟
اجنبی سایوں کے ہمسفر!!!

تم نے تو سارے چراغ ہی بجھا دیے---
دیکھو صبح بھی کتنی تاریک سی لگتی ہے۔
اسے میدانوں کا رخ کیے کئی برس گزر چکے
ہیں--- مگر سرخ چناروں کے پتے زرد ہو
کر زمین بوس ہونے کی رت آتے ہی
پیڑوں سے اک شور بلند ہوتا ہے---
پرندوں کے رخ پھیرتے ہی پربتوں کے
دکھ پوری شدت سے عود آتے ہیں۔جس
کے کانوں میں محبت مان بھری سرگوشیاں
کرتی تھی کہ
کہا نا!!!
مجھے تمھارے ساتھ بوڑھا ہونا ہے---"
اب وہ سناٹوں کا ہاتھ تھامے، در و دیوار سے
لپٹی تنہائی کی آغوش میں آنکھیں موندے
سسکتی ضعیفی کے نوحے تنہا ہی سنتی -------
ہے--- دور آسمان پر ٹوٹتے ستاروں کی نظر
جگر سوختہ پر پڑتی ہے تو اس کی آنکھوں کا پرسہ
دینے دہلیز پر آ گرتے ہیں
کون سمجھے گا؟؟؟
یہ میرے اندر مقام کرتے ہیں--- مجھے مقیم
کرتے ہیں---
یہ ستارے--- میری وحشتوں کے گواہ
ستارے---
یہ چارہ گر ستارے---

☆☆☆☆☆

# گمشدہ منزل

بجلی تیزی سے چمکی تو سامنے کا راستہ ذرا صاف نظر آنے لگا - گھٹا ٹوپ اندھیرے نے سارے ماحول پر ایک انتہائی سیاہ دبیز چادر پھیلا دی تھی جس کے نیچے وہ پورا گاؤں اور اردگرد کے دیوقامت پہاڑ چھپ کر رہ گئے تھے اور مکمل اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا - ساری رات تیزی کے ساتھ برسنے کے بعد اس وقت بارش تھم چکی تھی مگر گہرے بادل اب بھی موجود تھے اور وہ تیزی سے جگہ بدل رہے تھے - ساتھ ہی تیز ہوائیں بھی چل رہی تھیں - کبھی کبھار چاند بھی کسی بدلی کی اوٹ سے نمودار ہوتا اور اندھیرے کی شدت میں کمی آجاتی - شدید بارش کے بعد تیزی سے نیچے کی جانب بہنے والے پانی کی آواز ایک عجیب اور دلکش تاثر پیدا کر رہی تھی اور وقفے وقفے سے گھٹاؤں کی گھن گرج بھی سنائی دیتی - گاؤں پہاڑ کے دامن میں تھوڑی اونچائی پر واقع تھا - بلند و بالا پہاڑ کے بیچوں بیچ ایک ہموار قطعہ زمین پر بنے ہوئے گھر اور آس پاس موجود چھوٹے چھوٹے کھیت دیکھنے والوں کو مسحور کر دیتے تھے - یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پہاڑ کا یہ حصہ اسی گاؤں کو بسانے کے لیے باقاعدگی سے تراشا گیا ہے - اردگرد بھی بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ دور تک پھیلتا چلا گیا تھا - یہی پہاڑ مضبوط محافظوں کی صورت میں گاؤں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے - بارشوں کے بعد مختلف پہاڑی راستوں اور نالوں سے پانی بہتا ہوا مختلف سمتوں سے آ کر ایک بڑی ندی کی صورت اختیار کر لیتا: اور یہی بڑا ندی نما نالہ گاؤں کے سامنے سے گزرتا تھا - اسی کا پانی گاؤں کے مکین اپنی ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے تھے اور مویشی بھی یہیں اتر کر اپنی پیاس بجھاتے تھے - گاؤں کی دوشیزائیں اور خواتین چند میٹر نیچے اتر کر اسی ندی کے کنارے بیٹھ کر کپڑے دھوتی تھیں اور اکثر گھر کے گندے برتن بھی دھونے لے جاتیں - اسی نالے کے کنارے کنارے بنا ہوا کچا اور پتھریلا راستہ گاؤں والے باہر آنے جانے کے لئے استعمال کرتے تھے -

نور کمال شاہ

گاؤں کے اوپر کی جانب بھی اسی پہاڑی نالے کے کنارے کنارے رستہ موجود تھا جس کے ذریعے بارش اور مختلف چشموں کا پانی نیچے ندی میں بہہ آتا تھا- یہ رستہ مختصر مگر بے حد سخت تھا-

اس نے نالے کے کنارے کنارے اوپر کی جانب سفر شروع کیا - پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا اور اوپر کچے راستے تک چڑھ آیا تھا- کئی جگہوں پر رستہ نالے میں سے ہو کر گزرتا تھا اور گزرنے والوں کو پانی میں اتر کر آگے بڑھنا پڑتا تھا؛ کچا راستہ پھسلنی بھی تھا اور خود کو پھسلنے سے بچانے کے لئے اسے بار بار ان درختوں اور پودوں کی جھکی شاخوں کو پکڑنا پڑتا تھا جو نالے کے کنارے اگے ہوئے تھے- تاریکی کی وجہ سے کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا- وہ اندازے سے آگے بڑھتا رہا- کئی دفعہ وہ گرتے گرتے بچا؛ ایک دفعہ تو نالے کے تیز پانی میں پھسل کر بہتا چلا گیا مگر پھر اس نے ایک چٹان پکڑ کر خود کو سرکش پانی کی ضد سے نکالا، جو انتہائی جوش کے عالم میں اپنا سر آس پاس موجود چٹانوں اور پتھروں سے ٹھکرا رہا تھا- ایک گھنٹے کی طویل جدوجہد کے بعد وہ ایک طرف کے پہاڑ اور نالے کو عبور کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا- اب راستہ ذرا مناسب اور ہموار تھا مگر آگے جا کر اسی قسم کے ایک اور دشوار گزار راستے کو پار کر کے نیچے پہنچنا تھا تب ہی وہ ہموار پکی سڑک تک پہنچ پاتا- اصل میں اس نے شارٹ کٹ کے لیے پہاڑی راستہ اختیار کیا تھا ورنہ دوسری سمت ذرا آسان مگر طویل راستہ موجود تھا- گاؤں والے نالے کے راستے کو شاذ و نادر ہی استعمال کرتے تھے کیونکہ انتہائی مختصر ہونے کے باوجود یہ راستہ نہایت سخت تھا - اُس نے اِس راستے کا انتخاب اس لیے بھی کیا تھا کہ کسی کے نظروں میں آئے بغیر وہ جلدی سے یہاں سے نکل جائے- ہموار راستے تک پہنچ کر اس نے مڑ کر ایک نظر تاریکی میں ڈوبے گاؤں پر ڈالی اور اگلے لمحے نیچے اترتا چلا گیا-

---

پتہ نہیں ذہانت اور دانائی اس کے حصے میں کیوں اور کیسے آئی تھی، حالانکہ وہ خود اپنی قابلیت کا بالکل قائل نہیں تھا - یہ کیسی قابلیت ہے جو اسے دنیا میں زندگی گزارنے کا ڈھنگ نہیں سکھا سکی؛ بہر حال اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بے حد ذہین ہے اور یہ بات حقیقت بھی تھی کہ وہ ذہنی لحاظ سے

نہایت ذرخیز تھا مگر صرف کتابی علوم کی حد تک- دنیا میں زندگی گزارنے کا ڈھنگ، لوگوں کے رویے برداشت کرنے کا فن اسے بالکل نہیں آتا تھا - سیدھا سادھا، معصوم اور بھولا بھالا- شاید اسی ذہانت کا کمال تھا کہ اسے ہر امتحان میں امتیازی کامیابی ملتی اور اُسی ہی کے نمبر سب سے زیادہ آتے - اس نے میٹرک اور انٹر کے امتحانات نمایاں نمبروں سے پاس کر لیے تھے- گھر کے حالات اس کے لیے کبھی بھی سازگار نہیں رہے - گھر میں آئے روز لڑائیاں ہوتی رہتیں؛ والد کی جا و بے جا اور بے تحاشا مار پیٹ اس کا مقدر بن چکا تھا- شاید والد محترم بھی اپنی پریشانیوں اور مسائل کا شکار تھے اور اسے پیٹ کر اور اس کی والدہ کو پیٹ کر وہ دل کی بھڑاس نکالا کرتے - والدہ بے چاری اسے دلاسا دینے اور کسی طور والد کے غیض و غضب سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالتی مگر وہ اکثر اسے بچا نہیں پاتی تھی؛ اسی صورت میں وہ خود کو پیٹنے کے لئے پیش کر دیتی مگر بے سود- اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اس کا باپ اسے مارنے کے لیے ڈنڈا لے کر دوڑا تھا- اس وقت وہ اپنی معصومانہ شرارت کی تسکین کے لیے گھر کے دیوار کے اوپر چڑھ کر بیٹھا ہوا تھا- والد کے ہاتھ میں شہتوت کی ٹہنی ڈنڈے کے طور پر موجود تھی؛ یہی ڈنڈا وہ اسے مارنے کے لیے اٹھا لایا تھا- ڈنڈے سے بچنا اور بھاگنا ممکن نہیں تھا- ڈنڈے اس کی پیٹھ، پیروں اور جسم پر برسنے لگے- اس کی اپنی فلک شگاف چیخوں کے ساتھ ماں کی چیخیں بھی شامل ہو گئی تھیں جو اسے بچانے کے لئے وہاں پہنچ چکی تھیں- اس نے اللہ اور رسول کا واسطہ دے کر والد کو روکنے کی کوشش کی کہ بے شک مجھے مار لو جتنا مرضی، مگر اس معصوم کو چھوڑ دو- والد نے اسے تو نہیں چھوڑا البتہ والدہ کو بھی اس پٹائی میں شامل کر لیا تھا- ڈنڈا ماں جی کے شاید ماتھے کے اوپری حصے میں لگا تھا جب ہی تو اس کے ماتھے سے سرخ سرخ پاکیزہ خون بہہ کر اس کے سفید لباس کو گلنار بنا رہا تھا- کئی ایک ایسے واقعات اسے یاد تھے جو شاید اس کی آنے والی زندگی کی ناکامی کی بنیاد رکھ رہے تھے-

انٹر پاس کرنے کے بعد اسے ایک سرکاری محکمے میں معمولی سی ملازمت بڑی آسانی سے مل گئی کیونکہ کسی بھی امیدوار کے نمبر اس کا مقابلہ نہیں کر پائے تھے اور شاید وہ زمانہ بھی ایسا تھا جب قابلیت، اہلیت اور انصاف کا لحاظ رکھا جاتا تھا- ڈر، خوف، گھبراہٹ

اور پریشانی کے جو جراثیم گھر میں اس کے جسم میں جنم لے چکے تھے، پھلتے پھولتے رہے- گھر کے بعد سکول میں بھی ڈر اور خوف کا یہی عالم باقی رہا- ان دنوں سکولوں میں سزا کا تصور بہت سخت ہوتا تھا- غلطیوں پر یا سبق یاد نہ کرنے پر کڑی سزا ملتی تھی، جبھی تو ان دنوں آپ ڈنڈے کے بغیر استاد کا تصور نہیں کر سکتے تھے- مگر اس کا معاملہ مختلف تھا- اسے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر بہت کم سزا ملتی تھی بلکہ اکثر دوسرے شریر بچوں کی سزا میں اسے بھی حصہ دار بنا دیا جاتا تھا- سزا کسی اور بچے کو ملتی تو ہاتھ پاؤں اس کے پھول جاتے تھے؛ چہرے کا رنگ اڑ جاتا؛ ہاتھوں اور پیروں پر لرزہ طاری ہو جاتا اور جب تک استاد محترم سزا کا عمل مکمل کر کے بیٹھ نہ جاتا، اس کی یہی کیفیت برقرار رہتی، مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی- کسی نے بھی اُس کی اِسی خوف اور گھبراہٹ کا علاج ڈھونڈنے کی سعی نہیں کی- نتیجتاً چڑچڑا پن، خوف اور غصہ اس کی مزاج کا مستقل حصہ بن گئے- ایسی ہی حالت میں وہ جوانی تک پہنچا- ماں باپ مر چکے تھے- اس کی شادی کرا دی گئی تھی مگر جس سہارے کی اسے ضرورت تھی وہ اسے بیوی کی صورت میں بھی میسر نہیں آیا تھا- اس کے طبیعت اور مزاج کے بالکل برعکس بیگم صاحبہ گھر میں تشریف لا چکی تھیں- والدین کے مرنے کے بعد عملی طور پر وہ ہی اپنے کنبے کا نگران بن چکا تھا- چھوٹا سا کنبہ جس میں اس کی ایک بچی اور بیگم شامل تھیں- عملی طور پر اب اسے ہی معاشرے کا سامنا کرنا تھا- شوخ، شریر، چالاک اور بے حس معاشرہ اور اس جیسا سیدھا سادھا اور اندر سے پوری طرح ٹوٹا ہوا انسان، اس معاشرے کے ساتھ چلنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا- مگر جینا تو تھا ہی، خواہ جیسے بھی ہو- زندگی کی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو آگے دھکیلنا تو تھا ہی- لوگوں کی مکاری، فریب اور دوغلے پن سے گھبرا کر اس نے تنہائی اختیار کر لی- بہت کم کسی سے ملتا؛ کام کے بعد سیدھا گھر آتا اور پھر اگلی صبح تک گھر میں ہی پڑا رہتا- اس میں کسی سے ملنے، بات کرنے یا جواب دینے کا حوصلہ ہی نہیں تھا- شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھا- دفتر میں بھی یہی کیفیت تھی؛ اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا اور اس کا ذہن کام کرنا چھوڑ دیتا- خیالات، جذبات اور تفکرات کا سیلاب اسے کتابوں کی جانب لایا- اس نے کتابیں پڑھنا اور ساتھ ہی لکھنا بھی شروع کیا- اپنی تحریریں اخبارات اور رسائل کو

بھیجتا اور وہ فرضی نام سے چھپتیں، کیونکہ اپنی اندرونی خوف اور تمسخر اڑنے کے ڈر سے وہ انھیں اپنا نام دینے سے قاصر تھا۔ وہ لکھتا رہا، تحریریں شائع ہوتی رہیں اور وہ تنہا سے تنہا ہوتا چلا گیا۔ اس کے خوف اور بے چینی میں اضافہ ہوتا رہا۔ کوئی کچھ بھی کہتا، اس کے اندر جواب دینے کا حوصلہ نہ ہوتا، گھبرا جاتا، رنگت تبدیل ہو جاتی اور لوگوں کے لئے یہ صورت حال کافی دلچسپ ہوتی۔ لوگوں کو بھی شاید کھیلنے کے لیے ایسے ہی کھلونے کی ضرورت تھی۔

برسات کے دن تھے۔ موسم کے تیور کافی خطرناک تھے۔ امسال ساون کھل کر برسنے کے لئے بے تاب تھا۔ پل بھر میں آسمان کالی کالی گھنگھور گھٹاؤں سے ڈھک جاتا اور چھاجوں مینہ برسنے لگتا۔ ندی نالے چڑھ آتے جو اپنے پیچھے بڑی تباہی چھوڑ جاتے۔ زمین نالے کی ضد میں آجاتی۔ مویشی تیز پانی میں بہہ جاتے۔ فصلیں تباہ ہو جاتیں۔ گاؤں کے کچے مکانات کی چھتیں اور دیواریں گر جاتیں۔ گلیوں میں گھٹنوں گھٹنوں تک پانی بہنے لگتا۔ ایسی ہی ایک رات کو آخری پہر وہ اٹھا اور خاموشی سے کسی کو کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گیا۔ گھر والے سو رہے تھے؛ کسی کو اس کے جانے کا پتہ نہیں چلا۔ صبح کو فکر ہوئی۔ جب وہ دیر تک واپس نہ آیا تو گھر والے چیختے چلاتے اِدھر اُدھر تلاش میں دوڑے۔ اسے ڈھونڈنے کی کافی کوششیں کی گئیں۔ آس پاس کے گاؤں کو بھی خبر کر دی گئی مگر پتہ نہیں وہ کس طرف کو نکل چکا تھا اور اب کس حال میں تھا: کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ تین دن تک برابر اس کی تلاش جاری رہی۔ گاؤں کے لوگ گھر والوں کے ساتھ برابر تلاش میں لگے رہے۔ آخر تھک ہار کر تلاش کا کام ختم کر دیا گیا۔

عین اُسی دن وہ مل گیا۔ گاؤں کے دو چرواہے اپنی بکریوں کو چراتے پہاڑ کی دوسری جانب اترے تو انھیں نالے کے کنارے ایک بڑی چٹان کے نیچے اُس کا ادھ موا جسم پھنسا ہوا ملا۔ وہ زندہ تھا۔ وہ دوسری طرف اترتے ہوئے پہاڑی نالے میں گر گیا تھا اور تیز سرکش پانی نے پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ پتھروں اور چٹانوں سے ٹکرانے کی وجہ سے سر اور چہرے پر چوٹیں آئی تھیں۔ اُس کی حالت بہت خراب تھی۔ گاؤں والے اُسے چارپائی پر ڈال کر گاؤں لے آئے اور وہ چارپائی پر پڑے پڑے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ زندگی اب اُس کا کون سا امتحان لینے والی ہے۔

☆☆☆☆☆

# میری نانی امّاں

نام اُن کا کرم بی بی تخلص عاجزؔ تھا۔ دُکھوں کی ایک ایسی گٹھڑی جو صبر و رضا کا پیکر تھی۔ 27 سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔ 8 بچوں کی والدہ تھیں جن میں سے چھ بچے بچپن ہی میں فوت ہوگئے۔ ایک مُوذی وبا سے دو بچے ایک ہی دن میں فوت ہوئے۔ صرف دو بچے باقی رہ گئے (ایک میری والدہ اقبال بیگم اور ایک میرے ماموں محمد صدیق) بیوہ ہونے کے بعد اُنہیں نکاح کے کئی پیغام بھی آئے لیکن ان کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ میرے لئے میرے یہ دو بچے بہت ہیں۔ اب میری ساری توجہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگئی ہے۔ پھر اُنہوں نے قرآن مجید کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو عمر بھر جاری رہا۔ اسی نسبت سے وہ اُستانی صاحبہ کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ گھر میں ہر روز محلّے کے بچے بچیاں اُن سے قرآن پڑھنے آتے تھے۔ پڑھنے والے کی عمر کے مطابق ناظرہ بھی پڑھاتی تھیں اور ترجمے کے ساتھ بھی۔ ہر اتوار کے روز وہ ایسا پُرتاثیر درسِ قرآن دیتی تھیں کہ بڑے بڑے علماء کی بیٹیاں اور بیویاں اس درس سے فیضیاب ہوتی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ اُستانی صاحبہ کے اکلوتے بیٹے (میرے ماموں محمد صدیق) کو عین جوانی میں گنگرین کے مہلک اور اذیت ناک مرض نے آلیا۔ پہلے ایک پاؤں کی اُنگلیاں کٹوانی پڑیں تاکہ مرض آگے نہ بڑھے لیکن مرض بڑھتا گیا اور ٹانگ گھٹنے تک کٹوانی پڑی۔ پھر پوری ٹانگ آپریشن سے جدا کرنی پڑی۔ پھر دوسری ٹانگ کو یہ مرض لاحق ہوگیا۔ رفتہ رفتہ دونوں بازو اس مرض کا شکار ہوگئے اور آپریشن کے ذریعے

انور مسعود

بدن سے جدا کر دیئے گئے-1952 تک وہ دونوں بازوؤں اور دونوں ٹانگوں سے محروم ہو چکے تھے-اس بیماری نے 22 سال تک طول کھینچا۔

میرے ماموں کہا کرتے تھے کہ خودکشی اگر حرام نہ ہوتی تو میں اس کا مرتکب ہو جاتا- نانی اماں گھر میں گھی اور کپڑے کی تجارت بھی کرتی تھیں-اس آمدن سے ایک مدت تک بیٹے کی دواؤں اور پے در پے آپریشنوں کے اخراجات کی ذمہ داری نبھاتی رہیں- میری ممانی (نور بیگم) نے اس سنگین بیماری میں اپنے شوہر کی جس جانفشانی سے خدمت کی اُس کی مثال نہیں ملتی-

ماموں صاحب کو مطالعے کا بہت شوق تھا-اخبار، رسالے اور مختلف کتابیں مرض کی اذیت کے ساتھ بھی پڑھتے رہتے تھے- مجھے یاد ہے کہ نسیم حجازی کے ناول آخری چٹان، شاہین اور انسان اور دیوتا - میں نے، میرے ماموں اور میری والدہ نے مل کر پڑھے تھے-طویل موذی مرض سے آخر 1952 میں اُنہیں نجات حاصل ہوئی اُنکی رحلت کا دردناک سانحہ آج تک رُلاتا ہے- اللہ اُنہیں اپنے سایہء رحمت میں رکھے- آمین ! بیٹے کی وفات پر اُستانی صاحبہ نے کیسے درد انگیز شعر کہے:

آج وہ دن ہے ہوا لخت جگر مجھ سے جدا
رہ گئی مادر تڑپتی چھوڑ کر وہ چل دیا
آج وہ دن ہے ہوا مجھ سے جدا میرا پسر
چیر کر دیکھے کوئی میرا جگر میرا جگر
کس طرح سے آج میرے دل کے ٹکڑے ہو گئے
ہم تڑپتے رہ گئے اور وہ لحد میں سو گئے
آنکھ سے آنسو رواں، لب خشک، چہرہ زرد ہے
کس کو بتلاؤں کہ میرے دل کو کیسا درد ہے
آہ کہیں پاؤں، کہیں پنڈلی- کہیں بازو کٹا
میرے دل کا ٹکڑا ہائے ٹکڑے ٹکڑے یوں ہوا

.....

اُستانی صاحبہ بہت ہی عبادت گزار خاتون تھیں - بہت سے اور اردو وظائف اور پنج وقتہ فرض نماز کے ساتھ ہر روز مزید پانچ نمازیں بھی پڑھا کرتی تھیں -اپنی بیٹی (میری امّی) کو بھی ہر مکتوب میں نماز کی پابندی کی زوردار تاکید کیا کرتی تھیں- اُستانی صاحبہ کا کلام ایک ہی فریاد سے معمور ہے-ایک ہی تڑپتی اور سسکتی ہوئی آرزو اُن کی ساری شاعری میں سنائی دیتی ہے کہ مجھے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر مدینے پہنچ جاؤں- دیارِ حبیبؐ کی زیارت ہی اُن کی واحد تمنا تھی-

بڑی عجیب بات ہے کہ چودہ سال مسلسل وہ

حج کی درخواست دیتی رہی تھیں اور درخواست منظور نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس لئے کہ مختلف بیماریوں کے باعث وہ اتنی ضعیف اور نحیف ہو چکی تھیں کہ سفرِ حج کی متحمل نہیں تھیں۔ لیکن درخواست دے کر حج کی مکمل تیاری کرتی تھیں۔ درخواست جب نامنظور ہو جاتی تو اس صدمے سے اُنہیں شدید بخار اور خونی پیچش ہو جاتی تھی۔ وہ ایک صاحبِ کرامت خاتون تھیں۔ فرمایا کرتی تھیں کہ دیوار پر لکھا ہوا آجاتا ہے اُستانی صاحبہ یہاں پر آپکی زیادہ ضرورت ہے۔ اُن کی یہ کرامت بھی ظاہر ہوئی کہ ایک حج کے موقع پر ہمارے ایک عزیز حاجی کا بیان ہے کہ میں نے حج کے دوران اُستانی صاحبہ کو کئی بار دیکھا لیکن جب اُن کے نزدیک جاتا تھا تو وہ بھیڑ میں کہیں گم ہو جاتی تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُستانی صاحبہ گنگنا کر شعر لکھا کرتی تھیں۔ وہ راولپنڈی محلہ کرشن پورہ کی رہائشی تھیں۔ 1962 میں وہ اپنا مجموعہ کلام 'گل وگلزار' کے نام سے تعمیر پرنٹنگ پریس سید پوری روڈ راولپنڈی سے چھپوا کر گئی تھیں۔ مجموعے کے نام کے نیچے (مضطہ کرم بی بی عاجز) لکھا ہوا تھا اور کتاب کے ابتدائی صفحے پر یہ بھی درج تھا کہ کوئی مجھے ملنے نہ آئے میں ایک پردہ نشین خاتون ہوں۔ 'گل وگلزار' کا دیباچہ معروف ادیب و شاعر الطاف پرواز صاحب کا لکھا ہوا ہے جو درج کیا جا رہا ہے۔

''گل وگلزار' ایک ایسی پردہ نشین خاتون کے جذبات و خیالات کا آئینہ ہے جو ستائیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی اور جس نے سڑسٹھ برس کی عمر تک اپنے چھ بچوں کو یکے بعد دیگرے صبر و رضا کے ساتھ فرشتہ اَجل کے حوالے کر دیا۔

کسی خاتون کا اتنی چھوٹی عمر میں بیوہ ہو جانا اور پھر پے بہ پے جانکاہ صدمے اُٹھانے کے باوجود ثابت قدم رہنا بہت بڑے دل گُردے کا کام ہے لیکن جب انسان اپنے آپ کو راضی بہ رضا کر لے اور اپنی پوری زندگی کو خدا اور رسولؐ سے محبت کے لئے وقف کر دے تو اِس مادی دنیا کے علائق اُس کے پائے ثبات کو متزلزل نہیں کر سکتے اور اِس دنیا کی کوئی مصیبت بھی اُس کے لئے غم واندوہ کا سبب نہیں بن سکتی۔

عاجزہ بی بی پردہ نشین کے افکار و خیالات کے اِس مجموعے میں جو اشعار شامل ہیں اُن کو زبان و بیان یا فنِ شعر کے معیار پر پرکھنا دانشمندی نہیں ہے۔ یہ ایک دُکھی دل کی پکار ہے جس میں اپنے اندرونی غم کا اندمال خدا

سے لوگا نے ہی میں سمجھا گیا ہے۔

اس مجموعے میں اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں سے کام لیا گیا ہے اور خدا اور رسولؐ سے سچی محبت اور عقیدت کے اظہار کے لئے کسی مادی ضابطے کو خاطر میں نہیں لایا گیا۔ مبارک ہے وہ خاتون جس نے اپنی بیوگی کے دورِ الم کو صبر و ثبات سے طے کیا اور اپنے بچوں کے غم کو رضائے الٰہی جان کر برداشت کیا اور اپنی عمر قرآن و حدیث کے درس میں گزارنے کا عہد کیا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس مجموعے کو انہی جذبات کے ساتھ پسند و قبول کیا جائے گا۔

الطاف پرواز۔ راولپنڈی"

پندرہ فروری 1962

اُستانی صاحبہ کی ایک نظم سے مجھے انگریزی کی ایک نظم DEATH THE LEVELER یاد آتی ہے۔ نصیحت نامہ کے نام سے اُنہوں نے ایک طویل اور پُر تاثیر نظم لکھی ہے جس میں یہ شعر ہر بند میں دہرایا جاتا ہے کہ:

جد گل وچ کفنی پانویں گی
پھر کہیڑی ذات سداویں گی

............

اُن کی اس نظم سے یاد آیا کہ اُن کا وصال بڑی مبارک گھڑی میں ہوا۔ یہ 1969 کی جمعہ کی ایک رات تھی۔ رمضان شریف کا، مقدس مہینہ تھا اور سحری کا وقت تھا۔ جب اُستانی صاحبہ نے آخری سانس لیا تو بڑے زوروں کی بارش شروع ہو گئی اور ہوتی چلی گئی۔ جنازہ جب تیار ہوا تو بارش ایک دم تھم گئی۔ اُن کے جنازے میں شامل ہونے اور کندھا دینے کے لئے ایک انبوہ کثیر اُمڈ آیا۔ اُن کی وفات اور جنازے کے احوال پر "تسلیاں" کے عنوان سے میں نے ایک پنجابی نظم لکھی تھی جو درج ذیل ہے:

## تسلّیاں

ڈاہڈے سوہنے وقت اُنہاں دا
دم ہویا سی پورا
سرگی ویلا
رات جُمعے دی
رب دیاں رحمتاں برکتاں والا سی رمضان مہینہ
بخشیاں ہویاں
نیکاں پاکاں دی قسمت نیں
ایڈ مبارک گھڑیاں
ڈٹے ہوئے دے تُھّے
مدتاں بعد اُس راتیں جھلے
رَج کے رب دی رحمت وسّی
بدل آ کے اتھو اَج آں
لا بیٹھا سی جھڑیاں
اِنّی خلقت کٹھی ہوئی

میں کیہ دساں۔ اینا فیر جنازہ ہویا
کدی نہ ایناں کنیں سنیاں
کدی نہ ڈٹھا اکھیں
لوکی بھج بھج موڈھا دیون
اگے پچھے۔ سجے کھبے
دنیا اتوں، اوہناں چھیاں
نیک کمائیاں۔۔ کیسے کیسے نے کھٹیاں
مولا ودی قبر انہاں نوں
ڈاہڈی سنگھنی چھانویں
سدا بہار نے بوٹے اوتھے
تے اوہناں دیاں سوہنیاں شاخاں
جیوں پھلاں دیاں لڑیاں
دل وا بوجھ گھٹانا ہووے۔۔۔ لکھ ولیاں اتوں
بالک جے پرچانا ہووے
طفل تسلیاں بڑیاں

..............................

اُستانی صاحب کا اُردو اور پنجابی کلام حمد ونعت، مجمدی ماہیا، باراں ماہ، سی حرفی اور منظوم چٹھیوں پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حبِ نبیؐ اور روضۂ رسول کی زیارت کی حسرت ہی اُن کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کے ہاں ہر صنفِ شعر میں اسی مضمون کا سُلگتا ہوا اظہار ہے۔ اُن کے ہاں مشاق شاعروں جیسا فنی اہتمام تو نہیں البتہ ایک درد بھری چیخ ضرور سنائی دیتی ہے۔ سید وارث شاہ، سلطان باہو، مولوی غلام رسول اور میاں محمد کا رنگِ سخن بھی اُن کے ہاں دکھائی دینے لگتا ہے۔

آخر میں اُستانی صاحب کے کلام کا کچھ نمونہ درج کر رہا ہوں:

مکہ دُور تے دُور مدینہ
گذرے سالاں وانگ مہینہ
اے خدا کے لاڈلے پیارے حبیب
ہو زیارت روضے کی مجھ کو نصیب
قلب میرا نور سے معمور ہو کر
اپنی رحمت سے نہ مجھ کو دُور کر

..............................

متھا چن بدر تھیں روشن
کاکل کنڈل دار نبی دا
کیا سوہنا رخسار نبی دا۔ کیا سوہنا
قدرت دا چمکار نبی دا۔ کیا سوہنا
میں عاجز نوں سد بلائیں
للہ خیر حضوروں پائیں
رات دنے نت کراں دعائیں
ویکھاں کد دربار نبی دا
کیا سوہنا رخسار نبی دا۔ کیا سوہنا
قدرت دا چمکار نبی دا۔ کیا سوہنا

..............................

ماگھ مہینے ماہی میرا وسے شہر مدینے نی
وچ اُڈیکاں ماراں چیکاں گذرے سال مہینے نی
کیہ جاناں وچ ہجر پیا دے زہر کدوں تک پینے نی

تلیاں پھاتاں ماس مروڑاں بھٹ گھتاں اس جینے نی
دور ہوون سب روگ وجوداں جاواں جدوں مدینے نی

..............................

خاک پیا دے راہواں والی سُرمہ چشم لگاواں
دیدے دید بناں نت روندے کدوں تلائی جاواں
پھکن پھر پھر گلیاں اندر اپنا وقت لنگاواں
سینے سُول جدائیاں والے کس نوں حال سناواں
میں مختار کھڑی ہر ویلے کریں کرم دیاں چھاواں
عاجزؔ جے سد گھلے سوہنا سو سو جشن مناواں

..............................

جدوں وقت نزع دا آوے گا
آ ملک الموت ڈروائے گا
پھر کوئی نہ آن چھڑاوے گا
جدوں گل وچ کفنی پاویں گی
پھر کیہڑی ذات سداویں گی

..............................

جل باہجوں جیوں ماہی تڑپے تاں زندہ تاں مرنی آں
جیہڑا شہر ترے تھیں آوے دیدا وہدی جا کرنی آں

..............................

میں پاپن تے کرم کمائیں
قدماں دے وچ سد بلائیں

..............................

ماہی وسدا شہر مدینے
سکدیاں گزرے سال مہینے

..............................

آخر اُک کے تھک کے رولیندے
آوے صبر نہ ہجر دے ماریاں نوں

..............................

راہ تکدی نوں کئی سال گذرے
قسمت والڑے نظر منظور ہو گئے

..............................

ساون وی گھٹ کالی وانگوں برسن نین نمانے
ٹر گئے درد ونڈاون والے رہ گئے لیف سرہانے
اکھیاں وچوں پانی مکا جسموں خون سکایا
درد پیا دے کملی کیتی رو رو حال ونجایا

..............................

بیٹی کو خط لکھا
کیہ لکھاں میں لکھ نہ سکاں حال جدائیاں والے
اکھیاں دیوچ نیندر نہ آوے اندر ہاڑ سیالے
بھائی کو چھٹی میں لکھا
میرے جیہی بدبخت نہ ڈٹھی جے آکھاں رب
نوں ہتھ پسارو ویرا
ایہو درد ویہنوں اُٹھے پہر سیئے
ویکھاں کدوں محبوب دا شہر سیئے

..............................

کدی میل اُس کملی والڑے توں
جد ہے ہجر تھیں زخم ناسور ہویا

..............................

میں اِس مضمون کو اُستانی صاحبہ کے مصرعے
پر ختم کرتا ہوں:
بس کر عاجزؔ غم نہ ہوون درداں والے جھیڑے

☆☆☆☆☆

# میرے شامی صاحب

مجیب الرحمٰن شامی صاحب سے میری پہلی ملاقات آج سے تقریباً پچیس برس پہلے ان کے فیصل ٹاون والے مکان میں ہوئی تھی جب وہ اپنی ساری توانائیاں ''قومی ڈائجسٹ'' اور ہفت روزہ ''زندگی'' کو بنانے اور چلانے پر صرف کر رہے تھے۔ ''جنگ'' میں کالم بھی لکھ رہے تھے۔ ان دنوں فیصل آباد میں مقیم، جوانوں کی سی پھرتی دکھانے والے میرے عمر رسیدہ دوست نثار احمد کسانہ نے اپنی کتاب ''مطالبہء پاکستان اور چودھری رحمت علی'' مکمل کر لی تھی۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ اس کی تقریظ شامی صاحب سے لکھوائی جائے۔ شامی صاحب سے ان کی ملاقات کا وقت طے ہو گیا تو انھوں نے مجھے ساتھ لیا اور ان کے گھر جا پہنچے۔ شامی صاحب نے مسودے پر نظر ڈالی اور وعدہ کیا کہ دو تین دن میں تقریظ لکھ دیں گے۔ ہم دونوں ان کے لیے اجنبی تھے لیکن اس کے باوجود شامی صاحب نے مہمان نوازی کی روایت نبھائی۔ چائے بھی پلائی اور بسکٹ بھی کھلائے۔ ہم دونوں سرشاری کی کیفیت میں ان کے گھر سے پلٹے۔ کسانہ صاحب اس بات پر خوش تھے کہ ان کی کتاب کا آخری مرحلہ طے ہو گیا میں اس لیے مسرور تھا کہ میں نے پہلی بار اتنی بڑی صحافتی شخصیت کو قریب سے دیکھا تھا۔ تین دن کے بعد شامی صاحب نے کسانہ صاحب کو بلایا اور تقریظ ان کے حوالے کر دی۔ اس واقعے کے دو چار مہینے کے بعد شامی صاحب کے ایک پرانے رفیق کار اور خطاط نذیر انور صاحب نے مجھے بتایا کہ ہفت روزہ ''زندگی'' کے مدیر کی اسامی خالی ہے۔ تم چاہو تو تمھارے لیے شامی صاحب

ناصر بشیر

سے بات کی جا سکتی ہے۔ میں ان کی پہاڑ جیسی شخصیت سے اتنا خائف اور مرعوب تھا کہ میں نے انکار کر دیا لیکن نذیر انور صاحب بار بار کہتے رہے کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ آخر کار میں نے خوف اور رعب کی گرد جھاڑی اور نذیر انور صاحب کے ساتھ شامی صاحب سے ملنے چلا گیا۔ انھوں نے مختصر سا انٹرویو لیا اور مجھے کہا کہ کل سے دفتر آنا شروع کر دو لیکن پتا نہیں مجھے کیا ہوا کہ میں اگلے دن ''زندگی'' کے دفتر نہیں گیا اور میں اسی اخبار میں کام کرتا رہا جہاں برسوں سے کر رہا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد سیاست اور حالات و واقعات نے پلٹا کھایا۔ میں جس اخبار میں کام کر رہا تھا وہ شامی صاحب نے خرید لیا۔ میں میگزین سیکشن میں تھا۔ میں شامی صاحب سے منہ چھپائے پھرتا تھا کہ کہیں وہ یہ نہ پوچھ لیں کہ میں نے وعدے کے مطابق ان کے ہفت روزے کے لیے کام کیوں نہیں کیا۔ آخر ایک دن مجھے انھوں نے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں طرح طرح کے بہانے سوچتے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوا لیکن انھوں نے بڑے پن کا ثبوت دیا۔ انھوں مجھ سے پچھلی کوئی بات نہیں کی۔ البتہ اخبار کا ادبی صفحہ مرتب کرنے کے لیے مجھے کچھ ہدایات دیں اور جانے کی اجازت دے دی۔

شامی صاحب کی شخصیت کو میں نے قریب سے دیکھا تو ان کی بہت سی خوبیاں ظاہر ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ میں نے انھیں کبھی کسی سے تو تکار کرتے نہیں دیکھا۔ نائب قاصد سے مدیر تک کو وہ آپ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ جب ان کا اپنے رفقائے کار کے ساتھ کھانا کھانے کو جی چاہتا ہے، گھر سے دیسی مرغا اور زردہ پکوا کر لے آتے ہیں۔ اخبار میں کام کرنے والے چھوٹے سے چھوٹے ملازم کی خوشی غمی میں شریک ہوتے ہیں۔ خود نہ جا سکیں تو اپنے بیٹوں میں سے کسی کو بھیج دیتے ہیں۔ نہایت وسیع المشرب ہیں۔ ان کے دوستوں کے حلقے میں ایک عام سب ایڈیٹر سے لے کر وزیر اعظم تک شامل ہیں۔ حافظہ ایسا ہے کہ ہر شخص کو اس کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہمارے سارے پرانے ادیبوں اور صحافیوں میں یہ خوبی ہوا کرتی تھی کہ اپنے نام آنے والے ہر خط کا جواب فی الفور دیا کرتے تھے۔ شامی صاحب بھی یہ روایت نبھا رہے ہیں۔ خواہ کوئی بھی شخص فون پر میسج بھیجے، اول تو اسی وقت جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ فرصت پاتے ہی جواب دیتے ہیں۔ کیک اور مٹھائی کے بجائے کتاب کا تحفہ پا کر زیادہ خوش ہوتے

ہیں۔انھوں نے اپنے گھر میں ایک بہت بڑی لائبریری بنا رکھی ہے۔جس میں دنیا کے ہر موضوع پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔باقاعدہ کیٹلاگ بنوا رکھا ہے۔ کوئی بھی کتاب کسی بھی وقت آسانی سے تلاش کر لیتے ہیں۔

شاعری کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ اساتذہ کے ہزاروں اشعار یاد ہیں۔مجال ہے کہ کبھی کوئی شعر بے وزن ہونے دیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زیر زبر کی غلطی سے شعر بے وزن ہو جاتا ہے اس لیے اگر کسی شعر کے معاملے میں ذرا سی گڑبڑ کا بھی شک ہو تو کسی شاعر کو فون کر کے پوچھ لیتے ہیں۔ایک دن مجھے ان کا فون آیا۔انھوں نے ایک شعر مجھے سنایا اور کہا کہ اسے وزن میں کر دوں۔میں نے اسی وقت ایک آدھ لفظ آگے پیچھے کر کے شعر درست کر دیا۔وہ تو مجھے اگلے دن کا اخبار دیکھ کر پتا چلا کہ انھوں نے اپنے بیٹے کے ساتھ اس وقت کے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کا انٹرویو لیا تھا۔وہ شعر گیلانی صاحب نے غلط پڑھا تھا لیکن شامی صاحب نے اسے درست کرانے کے بعد چھاپا۔شامی صاحب میں ایک مدیر کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔بے وزن شعر یا کوئی غلط لفظ ان کے اخبار میں چھپ جائے تو بے چین ہو جاتے ہیں۔مولانا ظفر علی خان تو ایسے موقعے پر آسمان سر پر اٹھا لیا کرتے تھے لیکن شامی صاحب فقط اصلاح پر اکتفا کرتے ہیں۔جوہر شناس ایسے ہیں کہ نوجوانوں میں چھپے جوہر کو پہلی ہی نظر میں بھانپ لیتے ہیں۔نوجوانوں سے ان کی صلاحیت کے مطابق کام لینا جانتے ہیں۔اچھا منتظم وہی ہوتا ہے جو اپنے ماتحتوں سے ان کی صلاحیت کے مطابق کام لے۔انھوں فقط ایک شعر کی فی الفور درستی دیکھی تو مجھے حکم دیا کہ ان کے اخبار کے لیے ہر روز سات شعروں کی ایک غزل یا نظم لکھوں۔میں نے تعمیل کر کے دکھا دی تو مجھے شاعر پاکستان کا خطاب دے دیا۔ کہتے ہیں کہ ہر روز شعر کہنے والا شاعر رطب و یابس لکھنے لگتا ہے لیکن تمھاری شاعری میں روز بروز نکھار آ رہا ہے۔

میری کالم نگاری کے پیچھے شامی صاحب کی حوصلہ افزائی بھی کارفرما ہے۔ آج سے تقریباً برس برس پہلے میں نے ایک کالم لکھا اور اخبار کے مدیر قدرت اللہ چودھری کے حوالے کر دیا۔انھوں نے بغیر کسی قطع و برید کے چھاپ دیا۔شامی صاحب نے مجھے فون کر کے داد دی اور حکم دیا کہ اب کالم مسلسل لکھوں۔ساتھ ہی یہ بھی کہا: ''ہر روز کالم لکھ کر میرے پاس لے آیا کرو۔'' میں نے ایسا ہی کیا۔ہر روز کالم لکھتا اور شامی صاحب کے کمرے میں چلا جاتا۔وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر میرا سارا کالم پڑھتے۔جہاں کوئی

لفظ یا سطر بدلنا ہوتی بدلتے اور آخر میں اس کا نہایت مناسب سا عنوان تجویز کرتے۔ پورے دو مہینے انھوں نے مجھ پر مسلسل توجہ دی۔ اس کے بعد گویا انھوں نے مجھے فارغ التحصیل کر دیا۔ انھی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن میں چلڈرن کمپلیکس لاہور میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں شریک تھا۔ مجھ سے اگلی نشست پر شامی صاحب براجمان تھے۔ اچانک انھوں نے ایک لفافہ اپنی جیب سے نکالا اور میرے حوالے کر دیا۔ میں نے کھولا تو اس میں بارہ ہزار روپے تھے۔ گویا انھوں نے مجھے میرے کالموں کا معاوضہ دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد انھوں نے مجھے باقاعدہ ماہانہ اعزازیہ دینا شروع کر دیا تھا۔

شامی صاحب ایک محفل آرا شخصیت ہیں۔ جہاں بیٹھتے ہیں، محفل سج جاتی ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے شرکائے محفل پر سنجیدگی کا دورہ نہیں پڑتا۔ ہر چہرہ بشاش اور شگفتہ رہتا ہے۔ نئے لوگوں کی بات غور سے سنتے ہیں۔ ان سے مشورہ لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں۔ دوست احباب کے کام کرانے کے لیے فوراً فون کھڑکا دیتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی بھی ان کے دفتر یا گھر آ کر کوئی کام کہہ دے تو کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔

دو یا تین برس پہلے میں ملتان کے ایک ریستوران میں ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف، انور جمال اور فیاض تحسین کے ساتھ چائے نوش کر رہا تھا۔ وہاں شامی صاحب کا ذکر چل نکلا۔ فیاض تحسین نے کہا کہ انھیں شامی صاحب کی جانب داری پسند نہیں۔ ڈاکٹر اے۔ بی اشرف جھٹ سے بولے: ''میں تو شامی صاحب کا تجزیہ بہت توجہ سے سنتا ہوں۔ ان کے تجزیے میں ذاتی پسند، ناپسند شامل نہیں ہوتی۔ وہ پاکستان کے آئین کے مطابق بات کرتے ہیں۔''

میں نے بھی ان کی تائید کی اور کہا کہ اگر آپ شامی صاحب سے ایک دفعہ بھی ملے ہوتے تو شاید آپ کی رائے مختلف ہوتی لیکن فیاض تحسین صاحب پھر بھی اپنی بات پر اڑے رہے۔ میرے جی میں پتا نہیں کیا آئی کہ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے شامی صاحب کا نمبر ملایا۔ شامی صاحب نے فون اٹھایا تو اے۔ بی اشرف صاحب سے ان کی بات کرائی۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو چکیں تو شامی صاحب نے تینوں احباب کو لاہور آنے کی دعوت دی اور یہ بھی کہا کہ آپ تینوں میرے مہمان ہوں گے۔ شامی صاحب کا یہ رویہ دیکھ کر فیاض تحسین صاحب مان گئے کہ شامی صاحب واقعی ایک شخصیت ہیں۔

☆☆☆☆☆

# میں کون ہوں؟ [خاکہ]

تُو کون ہے؟ تم کون ہو؟ آپ کون ہیں؟ یہ سب سوال ایک ہیں لیکن پوچھنے والے کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ سوال اکثر میرے کان میں گونجتے رہتے ہیں اور ان کو سن کر میرے ذہن میں بھی سوال اٹھتا ہے میں کون ہوں؟ جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ لوگ مجھے کلیم کے نام سے پکارتے ہیں اور میں اس نام کا اتنا عادی ہو گیا ہوں کہ اگر سویا بھی ہوں تو مجھے کلیم پکارا جائے تو میں اٹھ بیٹھتا ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ میں کوئی کلیم نامی شخص ہوں۔ اگر میں اپنی تعلیمی اسناد کی پڑتال کرتا ہوں تو وہاں نام محمد کلیم نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میرا مکمل نام محمد کلیم ہے اور لازمی بات ہے یہ نام مجھے میرے والدین نے دیا ہوگا اور میں اب اسی نام سے لکھا اور پکارا جاتا ہوں، بعض من چلے کبھی کبھی کسی اور القاب سے بھی پکارتے ہیں۔ ان کی مرضی ہے کیا کہہ سکتا ہوں، لیکن سچی بات یہ ہے مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ میں اخبار میں اشتہار دے کر اس کو تبدیل کر لیتا۔ اس لیے ابھی تک محمد کلیم کے نام سے جانا جاتا ہوں۔

مجھے آئینہ دکھاتا ہے کہ میرا جسم کافی فربہ ہے بلکہ موٹاپے کی طرف مائل ہے شاید یہی وجہ ہے لوگ اکثر مجھے موٹا کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔ لیکن مجھ سے قسم لے لیں کہ میں نے آج تک خود کو موٹا نہیں سمجھتا ہوں اس لیے اپنے آپ سے اکثر پوچھتا ہوں میں سمارٹ ہوں ناں؟ اور جواب ملتا ہے جی بالکل۔

کہتے ہیں ناں:

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پچھلے بیس سال سے روزانہ ورزش کر رہا ہوں مگر مجال ہے جسم سے ایک رتی وزن کم ہو جائے ہر سال ماشاء اللہ دو تین کلو کا اضافہ ضرور ہو جاتا ہے یہاں میں نے سائنس کو مات دے دی ہے جو کہتی ہے کہ روزانہ ورزش آپ کو تندرست اور پھرتیلا رکھتی ہے جبکہ مجھے اپنے بستر سے اٹھنے کے لیے کئی کئی منٹ درکار ہوتے ہیں اور میں تو مزید سست روی کا شکار ہو گیا ہوں پھرتیلا پن تو دور کی بات ہے۔

رنگ گورا قد پانچ فٹ نو انچ اور بال کالے رنگ کے ساتھ کچھ سفید آن ملے ہیں مگر میں نے ان کو چپ رہنے کا کہا ہے اس لیے لوگوں کو میں قدرے جوان نظر آتا ہوں اور وہ کہتے ہیں بھائی آپ کے بال تو بڑے کالے ہیں۔

میرے جسم کی ڈیل ڈول، بڑوں کی باتوں اور حرکتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بندہ کا تعلق کاروباری یعنی بنیا کے پیشہ سے ہے آباؤ اجداد کئی نسلوں سے سونے کے کاروبار سے منسلک

محمد کلیم

ہیں لیکن بندہ ناچیز کیونکہ صلح جو، ملنسار اور ڈرپوک واقع ہوا ہے اس لیے سونے میں کھیلنے سے زیادہ کاغذوں (یہاں کاغذوں سے مراد کرنسی نوٹ نہیں ہیں) میں کھیلنا پسند کیا اور اس لیے سرکار کی منشی گیری کو اپنا رکھا ہے اور حد تو یہ ہے کہ سونے میں کھیلنے والے میرے رشتے دار بھی مجھے رشک (شک) بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں (حالانکہ اس میں رشک کی کوئی بات نہیں)۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ ہمارے ہاں سرکار ابھی تک شاہی فرمان جاری کرتی ہے اور رعایا حکم بجا لاتی ہے۔

لوگوں کی رائے ہے کہ میں بولتا بہت زیادہ ہوں اور جو بات دماغ میں ہوتی ہے وہی زبان پر ہوتی ہے (یعنی کہ منہ پھٹ ہوں)۔ کچھ لوگ اس بات کو سچے اور کھرے بلکہ کھردرے ہونا بیان کرتے ہیں اور دوسرے کہتے ہیں کہ جناب کب دنیاداری سیکھیں گے۔ اب معلوم نہیں دنیاداری کس چڑیا کا نام ہے اگر اس سے مراد بغل میں چھری منہ میں رام رام ہونا ہے تو میں اس سے تائب ہونا بہتر سمجھتے ہیں۔

تعلیم کوئی خاص نہیں صرف ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور بھی سیاسیات میں۔ یہاں وضاحت ضروری ہے کہ میرے پورے خاندان کا سیاست سے دور دور تک تعلق نہیں ہے ایک دور کے رشتہ دار نے ایک مرتبہ کونسلر کا انتخاب لڑا تھا اور ایک ووٹ لینے کا شرف حاصل کیا تھا اور نتائج کے بعد میاں بیوی میں اس بات پر لڑائی ہوئی تھی کہ ووٹ کس کا ہے کیونکہ دونوں کا دعویٰ تھا کہ یہ ووٹ انھوں نے ڈالا ہے اور مزے کی بات یہ ہے ابھی تک یہ بات طے نہیں ہو سکی اس لیے دونوں میں لڑائی جاری ہے۔

میرا بہترین مشغلہ باتیں بنانا اور لوگوں کو باتیں سنانا ہے (یہاں سنانے سے مراد وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں)۔ اگر میرے قریب لوگ نہ ہوں جن کے ساتھ میں باتیں بنا سکوں تو میں کاغذ پر باتیں بناتا رہتا ہوں۔ اور اگر کاغذ پر باتیں بنانے کا موقع نہ ملے تو اپنے بستر پر موٹے موٹے ناول پڑھ لیتا ہوں۔ بستر پر لیٹے لیٹے پوری دنیا کی سیر کرتا ہوں اور جب سیر کر کے تھک جاتا ہوں تو بستر پر لیٹ کر تھکن دور کرتا رہتا ہوں اور لوگ اس وجہ سے مجھے سست اور کاہل سمجھتے ہیں حالانکہ میں کتنا چلتا ہوں انہیں کیا معلوم۔

شادی شدہ ہوں اور پچھلے اٹھارہ سال سے اپنی آزادی اپنی مرضی سے زوجہ کے حوالے کر رکھی ہے۔ جس کا وہ بے دریغ استعمال کرتی ہیں اور خوش رہتی ہیں (ویسے یہ میرا قیاس ہے سچ جاننے کے لیے آپ کو ان سے رابطہ کرنا پڑے گا، اگر ہمت ہے تو کر لیں ورنہ میری بات پر یقین کر لیں)۔

یہ جو میں نے اپنا خاکہ لکھا ہے سب جھوٹے اور بکواس ہے اس لیے اس کو پڑھ کر قہقہے ضرور لگائیں مگر یقین مت کریں۔

☆☆☆☆☆

# ناگواری بھی ایک نعمت ہے [انشائیہ]

وہ خوراک جو ہم مزے لے کے کھاتے ہیں۔ جب اسی خوراک کو بیکٹیریا اور فنجائی decompose کرتے ہیں تو طرح طرح کی گیسیں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے تعفن اور ناگواری کا احساس ہمیں اس خراب (decayed) خوراک سے دور رکھتا ہے۔ فرض کریں اگر یہ ناگواری کا احساس نہ ہوتا تو بہت سے لوگ زہر آلود خوراک کھا کر مر جاتے۔ یہ اور بات کہ کچھ لوگوں میں یہ ناگواری کا احساس habituation کی وجہ سے ختم ہو جاتا ہے اور وہ زہریلی شراب پی کر مر جاتے ہیں جو مرنے سے بچ جائیں وہ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچ جاتے ہیں۔

بُو کی حِس انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً حلال خور جانور جیسے گائے، بکری، بھیڑ اور ''محترمہ'' بھینس مجال ہے جو کسی بدبودار گھاس کو منہ بھی لگائیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ زہریلے پودوں مثلاً آک (Calatropis procera)، ایلوویرا Aloe vera اور یوفوربیا Euphorbia کو جانور ان کی بو سے ہی پہچان لیتے ہیں اور ان کو منہ تک نہیں لگاتے۔ البتہ حرام کھانے والے جانوروں میں یہ بدبو کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی کوتاہ احساسی یا بے حسی ہے جس کی وجہ سے حرام خور جانور گندی چیزیں بھی کھا جاتے ہیں۔ انتہائی افسوس کے ساتھ اس امر کا ذکر کرنا پڑ رہا ہے کہ کچھ انسانوں میں بھی حرام حلال کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ حرام مال جمع کرنا اپنا فن سمجھتے ہیں جبکہ حرام خوراک مثلاً شراب کی بدبو سے ماورا (immune) ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے صادق آباد کے قریب جب فوجی فرٹیلائزر ملز لگائی جا رہی تھی تو صادق آباد سے آوارہ کتے ہمارے چائنیز اور کورین انجینئرز نے خوب رج،

صغیر احمد صغیر

رج کے کھائے۔ ہم تب سوچتے تھے کہ کیا ہی مذہبی تعاون ہے یعنی Religious mutulism. ہم بھی خوش کہ آوارہ کتے مٹک گئے اور انجینئر مہمانانِ ''گرامی'' بھی خوش کہ مفت میں کتا کڑاہی اور کتا روسٹ کے مزے۔

جہاں تک جانوروں کا تعلق ہے تو ان میں سے گدھ، گدھے، کتے اور خنزیر میں بُو کا احساس سب سے کم ہوتا ہے۔ بلکہ گدھ، گدھے، بجو اور سؤر میں تو سرے سے ہوتا ہی نہیں - اس لیے یہ جانور scavengers کا کام کرتے ہیں۔ یعنی مردہ خوری کا کام کرتے ہیں۔

حرام خوری دو قسم کی ہوتی ہے۔ اوّل ایسی حرام خوری ہے جس کا اوپر بیان کیا گیا۔ دوم، ایسی حرام خوری ہے جو بھائی اپنی بہن کا حق مار کر کرتا ہے یا باپ اپنی بیٹی کا حق مار کر کھاتا ہے۔ قارئین کرام ایسی ہی حرام خوری ہے جو ذخیرہ اندوزی کے ذریعے کی جاتی ہے۔ اس حرام خوری کا سب سے بڑا مرتکب حکمران طبقہ ہوتا ہے، جو غریب عوام کے نام پر قرضے لیتا ہے اور اس قرضے کی رقم سے وطن سے باہر محلات بناتا ہے۔ یہ حرام خور خود کو شیر کی طرح کا شکاری سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کے شکار کے left over یعنی بچے کھچے پر ان شیروں کے آس پاس منڈلانے والے کتے اور بھیڑیے ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ بعض معاشروں میں یہ اصول انسانوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ قارئین کرام رشوت اور سود کی بو کو ناک نہیں بلکہ دل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر احساس مر جائے تو رشوت، ذخیرہ اندوزی اور کمیشن سے کمائی گئی روزی ایک فن اور مہارت کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ اکیسویں صدی کا سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ اس نے احساس کا قتل کیا۔ اس پہ حد یہ کہ اس قتل کا سراغ لگانا بھی اب ناممکن نظر آتا ہے۔ اس لیے اب انسانوں کی habituation ایسی ہوئی ہے کہ وہ کہتے پائے جاتے ہیں ''کوئی بات نہیں، اگر کھاتے ہیں تو کچھ ہم عوام پر بھی تو خرچ کرتے ہیں''۔ منو بھائی نے ایک بار لکھا تھا کہ انسانی رویّوں کو مارکیٹ اکانومی نے بدل کے رکھ دیا ہے۔ بُو تو کیا غیرت کے معانی بھی مفقود ہو کے رہ گئے ہیں۔ منو بھائی نے اس بات کے حوالے سے بھارت کی ایک ریاست کی مثال دی جہاں لوگ اپنی بیویاں کرائے پر دے دیتے تھے۔

بُو کے بعد ناگوار آواز کا احساس بھی انسان اور جانوروں کے زندہ رہنے کے لئے انتہائی لازم ہے۔ بعض اوقات یہ ناگوار آواز خوف کا روپ دھار لیتی ہے۔ جس کے ردِعمل میں جانور اور انسان اپنی

زندگیوں کو محفوظ مقامات پر لے جاتے ہیں۔ اس ناگوار آواز کی بہترین مثالیں چنگھاڑتی ہوئی ہوا اور زلزلے کی آوازیں ہیں۔ جانور شیر کی چنگھاڑ سے جان جاتے ہیں کہ یہ خون خوار اب ان کی جان کو آئے گا۔ لہٰذا وہ اپنا بچاؤ کر لیتے ہیں۔ اہلِ علم اس عمل کو survival of species کا نام دیتے ہیں۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر عار نہیں کہ ناگوار آواز بھی قدرت کا ایک عطیہ ہے۔

قدرتی ماحول میں مختلف قسم کی آوازیں پائی جاتی ہیں۔ جہاں ایک طرف چہچہاتے پرندوں اور گنگناتی ندی کی آواز جو دل کرتا ہے بندہ پرندوں سے کہے:

ع

کوئی بات کرو،

خوشبو جیسی

کوئی بات کرو۔

اور ایک طرف گدھے کی آواز جو بکواس لگتی ہے۔ جی ہاں بالکل بکواس۔ گدھے کی طرح اونچا اونچا بول کر اپنی بات منوانے کے جتن کرنے والوں پر مجھے ترس آتا جو اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ O [لقمٰن۔ آیت 19] کی تصویر بنے جاتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو گدھے اور ہر اونچا بولنے والے سے گھن آتی ہے۔ لیکن یہ جو انسان کو اونچی آواز سے گھن اور خوف آتا ہے اس سے وہ اپنے بچاؤ کی تدبیر کر لیتا ہے۔ اس لیے آواز سے ناگواریت کا احساس بھی قدرت کی ایک نعمت عالیہ ہے۔

گرمی اور سردی کا احساسِ ناگوار بھی survival کا ایک ذریعہ ہے۔ جب جانوروں کو گرمی یا شدید سردی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس سے دور جائے پناہ ڈھونڈتے ہیں یہاں اس امر کا ذکر کرنا انتہائی لازمی سمجھتا ہوں کہ بخار ہمارا دشمن نہیں بلکہ دوست ہے جو الارم کی قدرتی گھنٹی کا کام کرتا ہے۔ اگر بخار نہ ہو تو جسم کے اندر کی خرابی چاہیے وہ metabolic ہو یا کسی جرثومے کی وجہ سے ہو اس کا علم ہی نہیں ہوگا اور انسان یا جانور موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ اسی لیے فرمایا:

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ

وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا - وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ - وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [البقرہ۔ آیت 216]

اسی لیے ایک کسی نے کیا خوب کہا ہے:

Fever is our friend not foe

یعنی بخار ہمارا دشمن نہیں دوست ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

# وہ خواب دیکھتی ہے
# *" She dreams "*

وہ خواب دیکھتی ہے

**She dreams**

وہ روز میرے خواب دیکھتی ہے

**She keeps up dreaming daily**

اسے خبر نہیں، وہ میرے خواب دیکھتی ہے

**She doesn't know even she dreams of mine daily**

سراب دیکھتی ہے

**Illusion is visible in her dreams**

وہ خواب دیکھتی ہے

**She dreams**

وہ خواب میں کتاب دیکھتی ہے

**She observes a book in dream**

اسے خبر نہیں وہ خواب میں مری کتاب دیکھتی ہے

**she doesn't know that she had a look at my book in dream**

کتاب میں بھی خواب دیکھتی ہے

**She sees the dream even in the book**

وہ خواب دیکھتی ہے

**Surely she sees the dream**

کتاب دیکھتی ہے

**So far she sees the book**

مری کتاب خواب باب باب دیکھتی ہے

**So she particularly have a look at every chapter of my dream's book ,respectively**

مری کتاب خواب، نکتہ نکتہ، سطر سطر، باب باب دیکھتی ہے

**Nevertheless she deems at every point, line or chapter of my dream 's book**

کہ موج موج خواب دیکھتی ہے

**Certainly she dreams in every way**

وہ سوہنی چناب دیکھتی ہے

**So the beloved thrives to view the Chenab River in her dream**

وہ خواب میں بھی خواب دیکھتی ہے

**She beholds dream within dream**

وہ خواب دیکھتی ہے

**Obviously she sees the dream**

سراب میں چناب دیکھتی ہے

**She observes the Chenab River in her imagination**

وہ میرا شہر خواب ہے مگر مراد یار خواب دیکھتی ہے

**That's my dream world yet she beholds the dream of beloved's aspiration**

گل غبار کی جگہ، گلاب دیکھتی ہے

**Instead of Rose dust she comprehends only a rose in dream.**

وہ خواب رنگ، خواب دیکھتی ہے

**That dream girl observes my dream**

وہ میرا خواب ہے، وہ میرے خواب دیکھتی ہے

**She is my dream yet she sees my dream**

وہ خواب خواب آنکھ صرف خواب دیکھتی ہے

**That starry eyed girl ,merely chasing up my dream**

مجھے نہیں، مگر وہ میرے خواب دیکھتی ہے

**Not mine , still she considers me in her dream**

وہ خواب دیکھتی ہے

**She thoughtfully observes the dream**

خالد احمد / مترجم: تعبیر علی

# خدا وہ دن نہ دکھلائے

خدا وہ دن نہ دکھلائے
کہ آنکھیں بھول ہی جائیں
حریمِ خواب کا رستہ
کہ پھر بادل میں چھپ جائے
کہیں مہتاب کا رستہ!

کہ پھر دیکھیں کسی اُمید کا بے دست و پا ہونا
دوبارہ سے دھندلکوں کے سفر میں مبتلا ہونا

نہ ایسا ہو
کہ وہ آتے دنوں کے خوش نما منظر
کہ جن کی روشنی سے ذہن و دل
میں ہر طرف ہر سو، چراغاں تھا
ہوا کا رزق بن جائیں
جواں جذبے کہ جن کی آہٹوں سے زندگی بیدار ہوتی تھی
قضا کا رزق بن جائیں

خدا وہ دن نہ دکھلائے
کہ اُن ہاتھوں میں گروی ہو مرے بچّوں کا مستقبل
کہ جو جب جی کرے رستوں میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں
وہ اُن کے واسطے بس ساحلوں کی ریت جیسے ہیں
کہ جن سے گھر بنا کر اُن کے بچے کھیلتے ہیں اور
جی بھرنے پہ اُن کو ایک پل میں توڑ دیتے ہیں

خدا وہ دن نہ دکھلائے
کہ میرے صحن میں اُترے
مرے دن رات میں آئے

کبھی پھر سے وہی ذِلّت، اذیّت اور دکھ کا بے ثمر موسم
کہ جن میں جھوٹ کو سچ کہہ کے جینا شرطِ اوّل تھا
کہ جن میں ''آبرو'' ''عزت'' ''خودی'' اور ''سر اُٹھا کر زندگی کرنا،
یہ سب باتیں
کسی بے کار سے ماضی میں گُم گشتہ فسانہ ہوں
کہ جن کو یاد کرنا بھی نہایت بے وفوقی ہے
کہ یہ متروک سکّے اب کہیں پر بھی نہیں چلتے

کہ اب بس ''مصلحت'' بھی ایک سکّہ ہے جو جاری ہے
اور اس نسبت سے جائز ہے جو ذِلّت ہے جو خواری ہے

یہ بستی اُس کرنسی کی چمک میں ہی نہ کھو جائے
یہی کانٹوں بھرا رستہ کہیں منزل نہ ہو جائے
کہ سچ پر جھوٹ ہو غالب
ہُنر اک عیب کہلائے
ہمارے ترجماں ٹھہریں
اندھیری رات کے سائے
خدا وہ دن نہ دکھلائے
خدا وہ دن نہ دکھلائے

امجد اسلام امجد

# تسلسل

تو جب شہزادہ باغی ہوگیا
اور شاہ کے سر کو فصیلِ شہر سے لٹکا کے
اطمینان سے لوٹا
محل کے اِک جھروکے سے
یہ منظر اُس کے بیٹے نے بھی دیکھا
اور تھوڑی دیر گم صم سا رہا،
پھر اُس نے اپنے باپ (شاہِ وقت) کے
سر پر نظر ڈالی۔

نسیمِ سحر

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آگ تاپی عجب ، عمر بھر ، بے طلب
جل بجھے ، اور اُٹھا دھواں بھی نہیں

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اب لہو بن کے بھٹک تو میری شریانوں میں
اے گماں ، تو نے یہ امکاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

# مرگِ انتظار

تو نہ آتا تو یہ خواب
اور کچھ دن یونہی زندہ رہتے
اور کچھ دن یونہی آنکھوں میں سجاتے ترے چہرے کے نقوش
اور کچھ دن یونہی سینے میں ترے نام کی دھڑکن رہتی
اور کچھ دن یونہی لمحہ لمحہ
تارِ مژگاں پہ پروتے تری چاہت کے ستارے،
تری خواہش کے حسیں رنگ، ترے لمسِ تصور کے کنول
اب جو تو لوٹ کے آیا ہے تو آنکھوں میں تری یاد،
نہ چاہت کے ستارے ہیں، نہ خواہش کے حسیں رنگ،
نہ پلکوں پہ ترے لمسِ تصور کے کنول
فقط اک نم ہے، نمِ شیشۂ جاں



خالد علیم

# رخصتی

پَربُریدہ اُڑتی ہے زرد رُو گھٹاؤں میں

جبر کی فضاؤں میں فاختہ اکیلی ہے

کاٹ ہے زبانوں سی، بے اماں ہواؤں میں

پَربُریدہ اُڑتی ہے زرد رُو گھٹاؤں میں

دب گئی ہیں سب چیخیں، بے نوا صداؤں میں

زندگی کے چنگل میں موت کی سہیلی ہے

پَربُریدہ اُڑتی ہے زرد رُو گھٹاؤں میں

جبر کی فضاؤں میں فاختہ اکیلی ہے

حامد یزدانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بکھری پڑی ہیں چار طرف سبز پتیاں
خالد ملا نہ سایۂ اشجارِ دوستی

## اگر تمؐ نہ ہوتے

اگر تمؐ نہ ہوتے، اگر تمؐ نہ ہوتے
گنہگار کس در پہ فریاد کرتے
کسے اپنا کہتے ، کسے یاد کرتے
اگر تمؐ نہ ہوتے، اگر تمؐ نہ ہوتے

O

جہاں میں اُجالا ہے نورِ نبیؐ سے
ہیں آفاق روشن ، اِسی روشنی سے
دِیے جل اُٹھے علم کی آگہی سے
گُزر جاتیں صدیاں اندھیروں میں سوتے
اگر تمؐ نہ ہوتے، اگر تمؐ نہ ہوتے

O

ہمیں کیا خبر تھی ، کہ ایمان کیا ہے
خدا کون ہے؟ اور قرآن کیا ہے؟
ہمارے لیے رب کا فرمان کیا ہے؟
بَسر ہوئی بار گُنہ ڈھوتے ڈھوتے
اگر تمؐ نہ ہوتے، اگر تمؐ نہ ہوتے

O

جہالت قیامت تلک راج کرتی
ہزاروں خداؤں کا محتاج کرتی
جو کل کر رہی تھی ، وہی آج کرتی
سدا لوگ رو رو کے دامن بھگوتے
اگر تمؐ نہ ہوتے، اگر تمؐ نہ ہوتے

O

غلاموں کو آزاد کروانے والے
تشدد سے جاں اُن کی چھڑوانے والے
تحفظ کا احساس دلوانے والے
گزرتے غریبوں کے دن روتے دھوتے
اگر تمؐ نہ ہوتے، اگر تمؐ نہ ہوتے

O

یتیموں کو نہلا کے ، سُرمہ لگا کے
نئے کپڑے پہنا کے ، کھانا کھلا کے
چلے عید گہ ، اپنی اُنگلی تھما کے
یہ گلیوں میں پھرتے یونہی روتے روتے
اگر تمؐ نہ ہوتے، اگر تمؐ نہ ہوتے

O

جہاں کل تلک تھیں خیانت کی باتیں
وہاں ہیں تمھاری امانت کی باتیں
دیانت کی باتیں، صداقت کی باتیں
ڈبو دیتی دنیا ، ڈبوتے ڈبوتے
اگر تمؐ نہ ہوتے، اگر تمؐ نہ ہوتے

O

انیسِ دل و جاں ! تمھارے کرم سے
خطاکار ، سرشار ہیں اک بھرم سے
شفاعت کے طالب ہیں شاہِ اُمم سے
یہ مر جاتے بارِ گنہ ڈھوتے ڈھوتے
اگر تمؐ نہ ہوتے، اگر تمؐ نہ ہوتے

محمد انیس انصاری

# یاد کا دسمبر

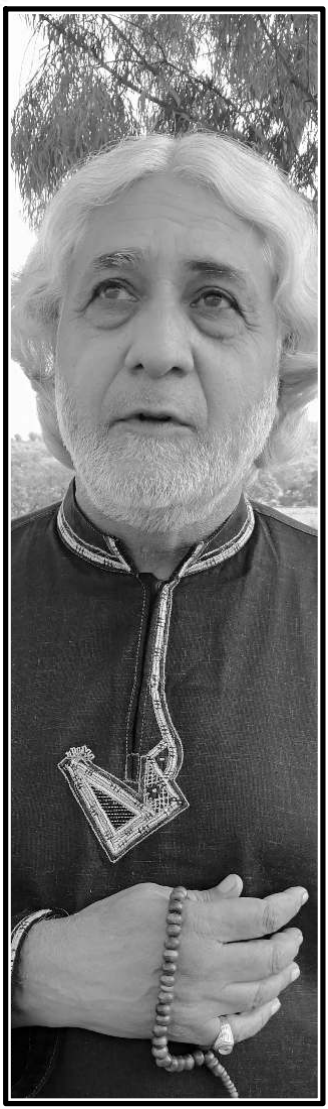

ٹھٹھرتے آنسوؤں کے
رقص میں وقفہ نہیں آتا
یہ آنکھیں پتھروں کے شور سے
بھاری نہیں ہوتیں
لبوں کی تلملاہٹ میں
کسی کی سانس چلتی ہے
کسی کی یاد سے بالوں کی رنگت
ڈھل نہیں سکتی
ہوا کو جسم کے ساحل سے
ٹکرانے کی جلدی ہے
مگر اب جسم پر برفیلے
زخموں کی اداکاری سے
موسم بھیگ جاتا ہے
سو اس موسم میں خوابوں کی
اداسی اور بڑھتی ہے
دسمبر میں محبت سرد پڑ جائے
تو جذبوں کا لہو جمتے ہوئے
تصویر بنتا ہے

اقبال سروبہ

# خالد علیم کے لیے ایک نظم

بس چپ چاپ اکیلے پن کے لطف اٹھانا
ہجر منانا
اپنی چاپ اور اپنی ذات کو پس منظر میں رکھ کر احساسات کی
ہر اقلیم سے ہو آنا
جذبوں کو تصویر میں لانا
ایک انوکھی دنیا میں
خاموشی سے آگے۔۔۔
آگے بڑھتے جانا
آس پاس کی کج بحثی پر ہنستے جانا
دھوپ میں اوروں پر سایہ بکھرانا
اور خود جلتے جانا
ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں!!
تم جانتے ہو؟
ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں
جو آس پاس کے منظر پر اک طنز بھری مسکان لیے بس
آگے بڑھتے جاتے ہیں!

نوید صادق

# گارے مٹی کا خدا

خزاں رسیدہ شجر سے جھڑتے ضعیف
پتوں کے خشک ریشوں کے لب پہ نوحوں
کے گل کھلے ہیں
سماعتوں کو قریب لاؤ
تنے کی ہچکی بلا رہی ہے
لرزتی آواز کے سہارے
ملول شاخوں کی سینہ کوبی
جو آیتِ ہجر کی تلاوت سے پیشتر ہی ہوا
کی وحشت کا زہر پینے کی جستجو میں پڑی
ہوئی ہے
مجھے بتاؤ سنی ہے تم نے
شجر کی سسکی خدا کو جو سرخ پانیوں کی ندی
کی جانب بلا رہی ہے
سنی ہے تم نے ہوائے نخوت کی خون ریزی
نہیں سنی نا!
اذیتوں کے نوکیلے خنجر یقین لے
کر، فریب دے کر
جو چھال کو زخم سونپتی ہے
سُنی ہیں سرگوشیاں شجر کی؟
ہر ایک پتا
اذیتوں کی الگ کہانی کا بوجھ لادے
خدائے برگ و ثمر کی جانب دعا کی ناؤ
کے ڈوبنے کا ہی منتظر ہے
عجیب ڈر ہے
عجیب غم ہے
مگر یہ مٹی سے بیر رکھتے خدا کا لہجہ شدید کیوں ہے؟
عجیب نخوت
ہر ایک شے کو رگیدنے پہ تُلا ہوا ہے
ہر اک شکایت کو اپنے پیروں سے روندتا ہے
کفن کی حسرت بدن سے روحوں کو کھینچتی ہے
سنی ہے چوں کی ننگی لاشوں پہ اوس پڑنے
کے بعد اُٹھتی غبارِ ہستی کی پہلی ہچکی
جسے کسی بھی نئے وِلاسے کی آب طلب
ہی نہیں رہی ہے
سنی ہے دھک دھک
وہ ڈوبتی دھڑکنوں کی دھک دھک
خزاں رسیدہ شجر کو سیراب کرتے پانی میں
دفن ہونے کی خواہشوں کو فریب دینے کی
دھن میں کب سے بھٹک رہی ہے
ہمارے ماتھے پہ اک نئے غم کی پھر سیاہی چمک رہی ہے

مگر یہ سب تم سنو گے کیسے
تمہیں تو صدیوں کے بہرے پن کا مرض ہے لاحق
تمہارے چہرے پہ ایسی آنکھیں بنی نہیں ہیں
سو تم نے دیکھا نہیں شجر کی تمام شاخوں کا
گریہ کرنا ہر ایک پتے میں چھید اور چھید
ایسے جن میں کئی زمانوں کی خستگی کے
نقوش ٹھہرے
عجیب غم ہے کہ سر بریدہ شہید پتے
نگارِ ہستی کے آئنے پہ جو روشنی کا برادہ
مل کر ہوا کے سینے سے لگ کے رونے کی
آرزو میں زمیں پہ گرنے سے پیشتر ہی
مرے ہوئے ہیں
تمہیں کوئی دکھ، کسی بھی لمحے، کہیں
بھی، محسوس کب ہوا ہے؟
تمہاری چپ سے میں آشنا ہوں
تمہارے منہ میں زبان کب تھی
کبھی نہ سوچا محبتوں میں اجڑ کے جینا
محال ہوگا
کہ سوچنے کو یہ نیلی، پیلی، ہری رگوں
میں، سیال بے رنگ بھی ہے درکار
مگر تجھے اب یوں سرخ رنگوں سے
آشنائی کا زہر پینے سے کون روکے
تو گارے مٹی سے ہی بنا ہے، مگر خدا ہے
سو میرے شکوے، گلے ندارد، بے کار میرا
یہ رونا دھونا
جو تم نے چاہا وہی ہوا ہے
جو تیری چاہت وہی تو ہوگا
بھلی ہے مجھ کو مری خموشی جو چپ سے
لاکھوں گنا بھلی ہے
خموش ہوں میں، خموش ہوں میں

دانش عزیز

# ریزہ ریزہ

پیپل کے پیلے پات
میں راضی اُس کی جیت پر
میں راضی کھا کے مات

---

سینے سے اٹھتی ہُوک
انجان سے میری دوستی
نادان مرا معشوق

---

آ، دیکھ مجھے تقدیر!
میں ہنستے بستے شہر میں
تنہائی کی تصویر

---

ویران ہماری گلیاں
سوکھے باغات ہیں جن میں
کھلتے ہیں پھول نہ کلیاں

---

پوچھو نہ ٹھور ٹھکانا
اک دشت ہے اپنا مسکن
وہ بھی ہے چھوڑ کے جانا

---

تقریبِ شعر شناسی
حلقے میں بیٹھے شاعر
اور چاروں اُور اداسی

ہم جس کے ہیں گرویدہ
پُر پیچ ہیں اس کی باتیں
ہے شخص بہت پیچیدہ

---

اس بار نہ بادل برسے
ہم لوگ پیاسے پنچھی
ہم بوند بوند کو ترسے

---

بیٹھا ہے ایک سوالی
آنکھوں میں جس کی آنسو
ہاتھوں میں کاسہ خالی

---

جب کھولا بند دروازہ
بستر پر لاش پڑی تھی
اور خون کسی کا تازہ

انصر حسن

# اپنی اپنی کائنات

کائنات ہے!
کیا یہاں پر کوئی کائنات ہے؟
زمین کے ہونٹوں سے پھسلتی ڈھلوانوں کے
کونوں کھدروں میں
چیونٹیاں
خوابوں کے ریزے تلاش کرنے
دعاؤں کے کشکول بھرنے کے لیے نکلتی ہیں
نجانے کتنے سراب
موتیوں سے قطروں میں ڈھلتے ہیں
ہوائیں
روشنی کے در و بام سے لپٹ کر خودکشی کرتی ہیں
تمنائیں
پھول، پانی اور آگ کا کفن اوڑھے
دن کے شکار پر نکلتی ہیں
اگر یہ کائنات ہے
جہاں زر کے لیموں کا ذائقہ کڑوا ہے
بھوک کی بیگار جھیلنے والوں کے لیے
سیاہ رات کی لعنت کا طوق
کشادہ سینوں کے درمیان میں لٹکتا رہتا ہے
خدشے
توقعات کے جوہڑ میں چھپے مگرمچھ نہیں دیکھتے
نیلامی کی کھوکھ سے ملنے والے پرندے
آسمان کی سفیدی میں گم ہو جاتے ہیں

اگر وقت کا کھیل
ہار جیت کی نگہداشت میں
توازن کا حُسن کھو دیتا ہے
تو پھر یہ کیسی کائنات ہے؟
جہاں پہ میں رہتا ہوں
جہاں پہ تُم رہتے ہو
جہاں پہ ہم سب
زندہ رہنے کی بے سُود اداکاری میں
اپنا آپ کھو دیتے ہیں

امجد بابر

# نظم

اک تماشہ سا ہے اب تلک روبرو پھر بھی خاموش ہوں

چاہتا ہوں کہ میں بھی کروں گفتگو پھر بھی خاموش ہوں

تیغ بن جائے میرا قلم دوستو اور میں ظلمت کی ساری جڑیں کاٹ دوں

یہ ارادہ مصمم ہے اور جستجو پھر بھی خاموش ہوں

خوشبو لوٹی گئی پھول مسلے گئے خواب غفلت میں وہ باغباں رہ گئے

ایسے کرداروں کی دیکھتا ہوں نمو پھر بھی خاموش ہوں

ظلم سہتا رہوں سر خمیدہ کروں ایسے جینے سے بہتر ہے پھر یوں مروں

ایسے کردار دنیا میں ہیں چار سو پھر بھی خاموش ہوں

رجب علی رجب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سبھی آنکھیں ہیں ، ہماری آنکھیں
گھل کے بہہ جائیں نہ ساری آنکھیں

# ہجر نصیب

فقط ایک چہرہ
جو لاکھوں نگاہوں کا مرکز رہا تھا
یہ سچ ہے محبت کا خونی جزیرہ
جواں سال جسموں کو کھا تا رہا تھا
مرے سارے سپنوں کی تعبیر تم تھے
یوں چاہت کی رنگین تصویر تم تھے
میں سارے زمانوں پہ پھیلی ہوئی تشنگی کی علامت
نہ اقرار اپنانہ انکار اپنا
بھڑکتے تھے جو شعلے سینے میں میرے
تپش بے بہا تھی مگر سارے شعلے
اجالے کا نعم البدل تو نہیں تھے
یہ جذبے تھے میرے یا تھی کوئی الجھن
مرے ساتھ تم تھے یا تھا کوئی لمحہ جو حیران
تھا اور پریشان تھا
میری بے چین وحشت زدہ روح اک لامکانی
بدن کے تعاقب میں سیماب تن بن کے مجھ
میں سرایت کیے مجھ کو گھائل کیے مطمئن تھی
یہاں ادھ کھلی آنکھ سپنے بھی کیسے چراتی
کہ خوابوں کی دنیا بھی میری نہیں تھی
مگر بے خیالی میں سیماب فطرت سکوں سے
ناواقف تمھاری محبت میں پاگل ہوئی تھی
کروڑوں جنم ہو چکے اب تلک پر نصیبا نہ بدلا
وہی ہجر میرا مقدر رہے اب تک
کہ جس لامکانی بدن کے تعاقب میں
کھویا تھا تم کو
تمھارا بدن تھا، وہ تم تھے۔
سو یہ ہجر میری خطا تھی
مرے کاسۂ دید میں تھے فقط چند سکے
محبت تمھاری
عنایت تمھاری
جو منزل سے بھٹکے پلٹ کر نہ دیکھا
جہاں تھے بتائے حسیں وصل لمحے
وہیں ہجر میرا مقدر بنا تھا۔

رخسانہ سمن

# نثری نظم

اداسی کے شجر پر

یاد کے گلاب مہکنے لگے ہیں

کل موسم کی پہلی بارش تھی

سنا ہے نم آنکھوں میں اترنے والے خواب دھندلے ہوتے ہیں

تعبیریں ادھوری رہ جاتی ہیں

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

الزام لگائیں گے ، یاروں پہ وہ کیا خالد
یاروں کے سوا خالد ، دشمن ہمیں کیا دیں گے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عکسِ کہن عکسِ گرِ عکسِ نو
صرف زمانہ غلط آہنگ ہے

# سبھی پتلیاں

پتلیاں
انگلیوں سے بندھی پتلیاں
کچی ڈوری کے تنکے سے حرکت کریں
ہر صدا پر لبوں کو ہلائیں
مگر خود نہ بولیں
جہاں ڈوریوں والا چاہے وہاں بیٹھ جائیں
جہاں سے اُٹھائے، اُٹھیں اور پھر
سامنے تالیاں پیٹتے اس نظر باز ٹولے سے
اپنی محکومیت کے بدل میں نیا روپ لیں
پتلیاں، انگلیوں سے بندھی پتلیاں
بادشاہ، ملکۂ عالیہ، شاہ زادی، کنیزیں سپاہ اور سالار بھی
سبھی پتلیاں، اور منڈوے میں بیٹھے ہوئے
منڈا سائیں، بڑے پیر جی، اعلیٰ حضرت
بڑے چودھری صاب جی، سبھی پتلیاں
پتلیاں، اور منڈوے میں بیٹھے ہوئے
نظر باز خلقِ خدا کے خدا
اک اشارے پہ گردن اُڑا دیں
مفادات کی ڈوریوں سے بندھے ہیں یہاں خلقِ خدا کے خدا
پتلیوں کو ہلاتی ہوئی انگلیاں تھک گئیں
مگر پتلیاں تازہ دم
ایک سیٹی پہ رقصاں لبوں کو ہلائیں
مگر خود نہ بولیں
پتلیاں سبھی پتلیاں

اعجاز رضوی

# خطوط

## دردانہ نوشین خان

مکرمی عمران منظور
السلام علیکم!
بیاض نومبر--- 2022 بندگی سے معطر حمدیں اور نگہائے عقیدت نعتوں سے آغاز ہوتا ہے قصیدہ حضور از قلم شاعر علی شاعر کمال کا ہے ہر شعر عمدہ ہے:

دل سے لگا کے رکھنا نشانی یہ آخری　　قرآن و اہلِ بیت ہیں تحفہ حضور کا

احمد ندیم قاسمی کی نعت گوئی پر علی رضا کا تجزیہ ان کی نعتیہ تخلیق کے ہنر سے روشناس کراتا ہے قاسمی صاحب کی کچھ نعتیں محافل میلاد کی شان بن کر جاوداں ہو گئیں:

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا　　اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا

کلیم خارجی کا مکتوب بنام بہرام پوری بہت دلچسپ ہے ایسے مہمان رحمت نہیں زحمت ہوتے ہیں۔
شاہد مالکی کے تعارف کردہ حمزہ یعقوب مظفر گڑھ کے قصبہ روہیلا والی سے تعلق رکھنے کے پیش نظر توجہ کا باعث بنے نوجوان شاعر کے کچھ اشعار تجربے اور مشاہدے میں ان کی عمر پہ سبقت لیتے ہیں:

شناخت سب سے بڑا نفسیاتی مسئلہ ہے　　میں چاہتا ہوں کسی شہ کا کوئی نام نہ ہو

بوڑھا باور چی روسی کہانی جسے حنیف باوا نے ترجمہ کیا سنگیت کی طاقت بتاتی ہے اچھی کہانی ہے۔ آسنا تھ کنول کا افسانہ ''گھر'' فنکارانہ بنت سے بڑھتا ہے اور خوبصورت انجام پہ ختم ہوا۔ ''گم شدہ'' وسیم جبران۔ مصائب مسائل اور وقت کا دباؤ نفسیات بدل دیتا ہے۔ حوریہ کی خالہ (خاکہ) رخشندہ نوید کی پر اثر تحریر ہے۔
escapemakeTo خالد احمد کی نظم کا تعبیر علی نے اردو ترجمہ کیا اور بیخل اور ترجمہ دونوں خوب ہیں۔
''والتین وزیتون'' گلزار بخاری اور عاطف جاوید عاطف کی نظم ''جب ریل کی پٹڑی رستے میں بازار سے پہلے پڑ جائے'' اچھی لگیں۔
مدیر صاحب سے درخواست ہے کہ مکتوبات کی چھپائی اسی فونٹ میں کی جائے جس میں 'بیاض' کی دیگر مشمولات ہیں۔ والسلام

## اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب
السلام علیکم!
ماہنامہ ''بیاض'' کا نومبر کا شمارہ موصول ہوا۔ علامہ اقبال اور احمد ندیم قاسمی جیسی شخصیات کی یادگار تصاویر کے ساتھ مزین سرورق دیدہ زیب لگ رہا ہے۔ حسبِ روایت حمد، نعت، بھرپور غزلوں اور نظم و نثر لیے ہوئے ایک بھرپور ادبی شمارہ ہے۔ اس میں حسبِ سابق شاعری کے علاوہ افسانوں اور مضامین کا خوبصورت انتخاب کیا گیا ہے۔
رسالہ کھولتے ہی دوسرے صفحے پر موجود خالد احمد کی نظم ''جوگی'' وجدان، سوچ و بچار اور غور و فکر کی ایسی کیفیات کی عکاسی کرتی ہے جسے کسی بہت ہی پہنچے ہوئے شاعر، صوفی یا قلندر اور درویش کو اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے:

انگ یہ کس کے رنگ رچائے　　آنکھیں بند کیے بیٹھے ہو
کس خوشبو سے تن مہکائے　　انگ یہ کس کے رنگ رچائے
آنکھ کی تہہ میں چراغ سجائے　　چادر آب لیے بیٹھے ہو

جناب فرحت عباس نے خوبصورت بولتی ہوئی ردیف میں حمد لکھی ہے۔

اے مولائے کائنات، کرم کا ہوں منتظر　　فرد گناہ میری اگرچہ ضخیم ہے

گلزار بخاری کے نعتیہ کلام سے یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ان کی توصیف کرنے لگتے ہیں　　لفظ خوشبو سے بھرنے لگتے ہیں

اعجاز رضوی کی نعت کا یہ شعر دیکھیے دونوں جہانوں میں رہنمائی کے تناظر میں اہمیت کی حامل ہے۔

میں ان کو مانتا ہوں اور ہی طریقے سے　　کہ وہ سہارا بھی ہیں رہنما ستارا بھی

جناب شاعر علی شاعر کا طویل نعتیہ قصیدہ بھی خاصے کی چیز ہے۔
خالد احمد کی غزل ایک غزل مسلسل کی طرح اپنا منفرد ثقافتی حوالہ رکھتی ہے۔ جس کا مخصوص آہنگ اور اسلوب ہے۔
غزلیہ کلام سے درج ذیل اشعار قابلِ ذکر ہیں:

عشق ہر حال میں راضی بہ رضا رکھتا ہے — ہم بدلتے ہیں مسرت میں کہاں غم میں کہاں — انور شعور
مٹ گئے اہلِ تخت و تاج سحر — ہم غریبوں کی شان باقی ہے — سحر انصاری
اس کے ماتھے پہ شکن کیا آئی — پڑ گئی ایک شکن کاغذ پر — نسیم سحر
سنا ہے اک جہانِ بے مکاں ہے دوسری جانب — بہت پھیلا ہوا کارِ جہاں ہے دوسری جانب — ممتاز اطہر
عمر گزری ہے جس طرح، اس میں — وقفۂ صبح و شام تھا ہی نہیں — اشرف نقوی
وہ جو ندا ہاتھوں میں لے کے ہوا ہو تو پار کر دوں — مری اٹی میں جنون اپنا اڑان غالب ہے اڑ گیا — سعدیہ بشیر

دیگر شعرا کی شاعری بھی خوب ہے۔ بیاض کو سوئی صدیہ کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے ادبی تحریک کو مہمیز کیا ہوا ہے۔ کہ ہر ماہ شعر و ادب کا ایک خوبصورت گلدستہ پڑھنے کے لیے میسر آجاتا ہے۔

---



فیض رسول فیضان

مخدومی عمران منظور صاحب، محترمی نعمان منظور صاحب، مکرمی اعجاز رضوی صاحب، آداب!
نومبر کا بیاض، دنیائے شعر و سخن کے عظیم الشان شاعر، علامہ اقبال اور رفیع المرتبت سخنور، احمد ندیم قاسمی کے تصویری ٹائٹل اور غزلیہ بیک ٹائٹل کے ساتھ نظر نواز ہوا:

بنام حضرتِ اقبال، عرض کر فیضان — وہ کائنات کے سب سے عظیم شاعر ہیں

اور

فیضانؔ بعد غالب و اقبال و میر کے — احمد ندیم قاسمی، سب سے عظیم ہیں

اور یہ گروپ بندی یا دھڑے بازی نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے کہ بعد از اقبال، قاسمی صاحب ہر لحاظ سے رفیع و عظیم ہیں۔ جن لوگوں نے ندیم کے مقابل، لابنگ کے بل پر چڑھنے، چڑھانے یا چڑھوانے کی کاوشیں کیں، گذرتے وقت کے ساتھ گرد راہ اور غبار خلا ہو کر رہ گئے۔ بقول خود:

فلک کو گھورنے والے بگولے — سپردِ خاک ہو کر رہ گئے ہیں

درد و غم کے حوالے سے میر بے مثال ہیں۔ فطرتِ انسانی کے حوالے سے غالب باکمال ہیں۔ مذہبِ اسلام اور فلسفے کے حوالے سے اقبال لازوال ہیں۔ تاہم دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ میر و غالب میں اقبال ناپید ہیں جبکہ اقبال کے یہاں، میر و غالب بھی بہ تمام و کمال جلوہ ریز ہیں۔ میر کے بہتر نشتر معلوم و معروف ہیں۔ غالب کے دو دیوانوں میں بیسیوں بلکہ سینکڑوں اشعار ترجمان اور دو زبان ہیں اور انہوں نے ایک ایک شعر (مثلاً):

جس طرف سے آئے ہیں آخر ادھر ہی جائیں گے — مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم پیمودہ ہے

اور

پشتِ محراب کی قبلے کی طرف رہتی ہے — محوِ نسبت ہیں، تکلف ہمیں منظور نہیں

ایسے درجے اور ایسے رتبے کا کہہ رکھا ہے کہ پوری اردو غزل سر بہ خم اور دست بستہ نظر آتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی، جب ہم شعرا شناسی قول اور قد و قامت کی تفریق کرتے ہیں تو ہمیں میر تو در کنار غالب بھی بحرِ اقبال کا ایک جزیرہ بلکہ قطرہ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے فیض مرحوم نے ایک انٹرویو میں اس شوخ و شنگ سوال کے جواب میں، جو کہ اقبال و فیض کے موازنے پر مشتمل تھا، اپنے آپ کو بجا اور بجا طور پر، کوہِ ادب، اقبال کے سامنے بعد کتنا اُچھلا ہوا ننھا چوزا قرار دیا تھا۔ فیض کا یہ حقیقت پسندانہ اعتراف، اَن گنت متکبر، بونا سازوں کو بھی آئینہ دکھا رہا ہے جو آئے دن کسی ایرے اور کسی غیرے کے ساتھ اقبال کا تقابل کر کے اپنے لٹریری کمپلیکس کو ایکسپوز کرتے رہتے ہیں۔
غزل اور افسانہ، معتبر اور نمایاں اصنافِ ادب ہیں اور پوری تاریخ میں، حضرت احمد ندیم قاسمی مرحوم ہی ایک ایسی واحد مثال ہیں جو کہ بر دو میدانوں میں فاتح شہسوار اور ساوی تاجدار نظر آتے ہیں۔ یوں تو موصوف کی ذات ہمہ صفت موصوف اور ہشت پہلو ہیرا ہے اور حمد و نعت، نظم و غزل، طنز و مزاح، ناول و افسانہ، کالم و خاکہ اور تنقید و تبصرہ سمیت کون سی صنف ہے جہاں آپ کی عظمت و رفعت کا پرچم، آن بان اور شان کے ساتھ نہیں لہرا رہا تاہم غزل و افسانہ کے حوالے سے موصوف اختصاصی شہرت اور آفاقی منزلت کے حامل ہیں۔
کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ نام نہاد ترقی پسند نقادوں کی اکثریت کو ذکرِ ندیم اور بابِ قاسمی میں اقرار نگاری کے سے کس لئے سانپ سونگھ جاتا ہے اور کیوں اُن کی بولتی بند ہو جاتی ہے تو مجھے یہی سمجھ آتی ہے کہ قاسمی صاحب کا اخلاف و جذب ہونا، مذکورہ مہربانوں کو ہضم نہیں ہوتا۔ جناب ندیم، نہ تو حقیقت نگاری کی آڑ میں جنسی آلودگی پھیلاتے ہیں، نہ ہی سیکولرزم کے نام پر دین کو گالی دیتے ہیں، نہ ہی لبرل

ازم کی اوٹ میں مذہب پر حملہ کرتے ہیں، نہ ہی حریت فکر کے پردے میں غیر اخلاقی و اہی تباہی کے ذریعے اسلامی اقدار کو رگیدتے ہیں، نہ ہی نظم و نثر میں بے مہار و بے لگام آزادہ روی یا عریانی و فحاشی کا پرچار کرتے ہیں بلکہ شراب و شباب سے مجتنب اور فحاشی و عیاشی سے محترز و نفور، پاکیزہ عملی زندگی گذارتے ہیں۔ شستہ اور متمدن اخلاقیاتی اقدار کے فروغ کی خوشبو کے سفیر بن کر نعت محض کہتے ہی نہیں بلکہ پورا مجموعہ نعت "جمال" تصنیف کر دیتے ہیں۔ ادبی رچاؤ کے ساتھ غزل سنوارتے اور خلاقانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ افسانہ نکھارتے ہیں جس کے صلے میں قدرت انہیں اہل نظر کی آنکھوں کا تارا اور ارباب دانش کے دلوں کی دھڑکن بنا دیتی ہے۔
حقائق کے برعکس ترقی پسندی اور کمیونزم کو مادر پدر آزاد سمجھنے والے سکہ بند اور ٹھپہ مارک نقاد جب یہ احوال دیکھتے ہیں تو زخمی سانپ کی طرح زہریلے تعصب کے ذریعے ایسے قلم کاروں، غزل نویسوں اور افسانہ نگاروں کو بانس کی پھنگی پر ٹانگنا اور لٹکانا شروع کر دیتے ہیں جو بیچارے کسی بھی زاویے سے حضرت احمد ندیم قاسمی کے پاسنگ بھی نہیں۔
افسوس! گفتگو طویل ہو گئی ہے اور شمارہ تازہ کے دیگر مندرجات، مضمون کے تجزیے میں شامل نہیں ہو سکے مگر اجمالاً ضرور عرض کئے دیتا ہوں کہ بیشتر مشمولات، حسب روایت معیاری ہیں۔ آپ لوگوں کی مساعی، جمیلہ کو تحسین اور بیاض کے فلک بوس تسلسل کو آفرین کے ساتھ ایک غزل اور منتخب اشعار پیش کر کے اجازت۔ والسلام۔

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو — آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں
پرسش اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری — ورنہ ظاہر تھا کہ سب کچھ کیا ہوا کیوں کر ہوا
جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا — ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں
راز حرم سے شاید اقبال باخبر ہے — ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ — علامہ اقبال
حسن بیگانۂ احساس جمال اچھا ہے — غنچے کھلتے ہیں تو بک جاتے ہیں بازاروں میں
عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن — یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ
کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا — میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
یہ دنیا استعاروں کا جہاں ہے — مجھے گل پر فرشتے کا گماں ہے — احمد ندیم قاسمی



رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی!
السلام علیکم!
نومبر کا شمارہ دو عظیم شخصیات علامہ اقبال اور احمد ندیم قاسمی کے سرورق کے ساتھ ملا۔ افتخار شاہد کے عقیدت بھرے اشعار پسند آئے
اداریے کی تنقید کا جواز فرحت عباس شاہ کا ایک دلچسپ اور تحقیقی مضمون تھا۔ علی رضا نے احمد ندیم قاسمی کی نعت گوئی کو بڑے احسن پیرائے میں اجاگر کیا۔ کلیم خارجی صاحب کمال لکھتے ہیں۔ "بہرام بالجبوری" طنز و مزاح سے بھرپور اتنی دلچسپ تحریر تھی کہ کیا بتائیں۔ ادھوا پایا کا خط پڑھتے ہوئے مجھے بھی ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یہ کچھ سال پہلے کی بات ہے۔ ادبی تقریب میں ایک صحافی سے گپ شپ ہوئی۔ وہ خود کو صحافی کہہ رہا تھا مگر تقریب میں اس کا دھیان کام سے زیادہ کھانے پر تھا۔ اس کا اندازہ اس وقت ہو گیا جب وہ کھانا کھا رہا تھا۔ مجھے لگا یہ شخص کسی تعلق کا استعمال کر کے صرف کھانے پینے کے لیے ہی آیا ہے۔ اس کی حرکتیں دیکھ کر یقین ہو گیا کہ سامنے بلا یا نہیں گیا بلکہ کسی تعلق کی وجہ سے یا کسی کے ساتھ آیا ہے۔ خیر بے تکلفی کی وجہ سے اس نے میرا موبائل نمبر لیا اور مجھے بھی دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد اچانک ایک روز مجھے ایک اجنبی نمبر سے کال آئی۔ حال احوال کے فوراً بعد اس نے کہا رانا صاحب کہاں ہیں۔ اتفاق دیکھیے کہ میں اس وقت بھی لاہور تھا اور اردو بازار میں تھا۔ میں نے کہا۔ جی میں لاہور ہوں، آپ کون ہیں اور کہاں سے بات کر رہے ہیں۔ اب اس نے اپنا تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی صحافی بھائی ہیں۔ موصوف کہنے لگے۔ رانا صاحب ہمیں گیزا (دھوکہ) نہ دیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آپ پورے والا ہی ہیں اور جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے کہا جناب میں کیوں جھوٹ بولوں گا۔ آپ کے تعارف سے پہلے میں نے بتایا ہے، بعد میں بتاتا تو آپ کہتے اچھے لگتے۔ خیر وہ نہ مانا اور یہی رٹ لگائے رکھی کہ نہیں آپ ہمیں کھانا نہیں کھلانا چاہتے تو الگ بات ہے۔ تحریر پڑھنے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ وہ صاحب بھی کلیم خارجی کے کردار و اکثر فاضل ہیوٹی جیسے ہی تھے۔
محمد احمد، شاہد اشرف، عادل سعید قریشی، شمیمہ سید اور مظفر اقبال کی تحریریں بھی دلچسپ رہیں۔ موجودہ ادبی صورتحال اور مدرسین کا کردار فیصل زمان چشتی کی ایک فکر انگیز تحریر تھی۔ علم و ادب سے وابستہ بہترین شخصیات نے اظہار خیال کیا۔
ماہ نومبر 2022 کے شمارہ میں اشاعت پذیر میری غزل کے شعر میں کمپوزنگ کی غلطی ہوئی ہے۔ غزل کا آخری شعر اس طرح ہے:

والدین جو زندہ ہوتے — شاہد خوب سہارا ہوتا

جو غزلیں پڑھی ہیں۔ ان میں جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی اور سعد اللہ شاہ کے اشعار پسند آئے۔

# کُل پاکستان مشاعرہ یومِ اقبالؒ، سیالکوٹ

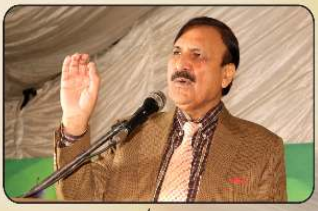

جناب انعام الحق جاوید

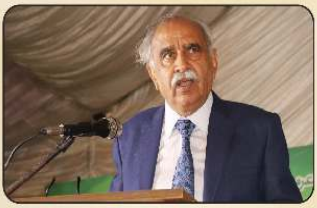

جناب محمد آصف بھلی

جناب فرحت عباس شاہ

جناب نعمان منظور

جناب ناصر بشیر

محترمہ صائمہ کامران

جناب عثمان ڈار

جناب ڈاکٹر کامران

جناب شاہد ماکلی

جناب غلام فرید (کمشنر گوجرانوالہ)

شرکاء مشاعرہ

شرکاء محفل